نقشِ فریادی
فیض احمد فیض
نیا ادارہ • لاہور

بعنایت مسز گلکرٹ -
نئی دہلی ۱۹۵۰

نقشِ فریادی

فیض احمد فیض

نیا ادارہ • لاہور

طبع چہارم
تعداد اشاعت گیارہ سو
پبلشرز : نذیر چودھری آف نیا ادارہ • لاہور
پرنٹر : ضمیر غوری آف گیلانی پریس • لاہور

دیباچہ

اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے، شاید اس میں دو چار نظمیں قابلِ برداشت ہوں۔ لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں، اصولاً مجھے جب تک انتظار کرنا چاہیئے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں۔ لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا ہے۔ شعر لکھنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر لکھتے رہنا ایسی دانشمندی بھی نہیں۔ آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبہ کے زیرِ اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے۔ لیکن اب مضامین کیلئے تجسّس کرنا پڑتا ہے، علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں، ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ اس منفرد اور معین تجربہ کے لئے کوئی موزوں پیرایۂ بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے۔ لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بیکار بھی، اول تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے پھر ان کی پیچیدگی کو دیانتداری سے ادا کرنے کیلئے کوئی تسلّی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں شاعر کے ذہن کا عجز ہے، ایک کامل اور قادر الکلام شاعر کی طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے اسے یا اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آ جاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتی ہے لیکن ایسے شعرا کی تعداد بہت محدود ہے، ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دستِ نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کے لئے کوئی سہل راستہ پیشِ نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریقِ اظہار

کو، ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورتِ حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے، اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

اس مجموعے میں نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے جس میں وہ لکھی گئی ہیں، پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں، انہیں حذف نہ کرنے کی تجارتی وجہ شروع میں عرض کر چکا ہوں نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے، وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے، ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے یہ سوچتا ہے، لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصہ کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکزِ دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیشِ نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے فارمولے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور یہی وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

بہر حال ارتکابِ گناہ کے بعد معذرت بیکار سی چیز ہے، اور ہر منصف کا حق ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے مطلق نظر انداز کر دے۔

ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔

فیض

مقدمہ

"نقشِ فریادی" ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگھم پر کھڑا ہے۔ اس کی سرشت تو اسے عشق کے ساتھ ہم آہنگ ہونے پر اکساتی ہے، لیکن وہ حقیقت کے روزن میں سے زندگی کی برہنگی اور تلخی پر ایک نظر ڈال لینے کی ترغیب کو روک نہیں سکتا۔

ادبی ذوق کا کوئی انقلاب اپنی ہیئت اور نتائج کے اعتبار سے اتنا وسیع اور اتنا شدید نہ ہوگا۔ جتنا ہمارے زمانے میں جمہور کے خیالات، احساسات اور عزائم کی بڑھتی ہوئی رو نے پیدا کیا ہے خود ہمارے ملک میں جہاں عوام کی بیداری کا ابھی آغاز ہے۔ غزل اور اس کے ساتھ "اشراف" کی دلپسند شاعری، جسے وہ اپنے خلافِ فطرت ہیجانات کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے آخری ہچکیاں لے رہی ہے ایک عرصہ سے یہ تصور رائج چلا آتا تھا کہ شاعری محض تفریح اور دل لگی کا سامان ہے حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ نے اس نظریئے پر سب سے پہلی ضرب لگائی۔ لیکن اس کی جگہ جو نظریہ انہوں نے رائج کرنا چاہا، اس کا مفہوم یہ تھا کہ شاعری صرف قوموں اور گروہوں کی اخلاقی زندگی سدھارنے کا ذریعہ ہے۔ جدید شاعری ان دونوں نظریوں کے خلاف ردِ عمل ہے، جدید شاعر نہ تو شاعری کو محض عیاشوں کی تفریح کا سامان قرار دیتے ہیں اور نہ اسے بگڑی ہوئی قوموں کا سستا اور سہل الحصول ہدایت نامہ، شاعری ان کے نزدیک ہماری زندگی کے لئے محض تفریح سے زیادہ اہمیت اور کہیں گہرا مفہوم رکھتی ہے وہ اس کے تفریحی پہلو کے منکر نہیں لیکن انسانی زندگی اور ہماری روزانہ سرگرمیوں پر اس کے خاموش مگر عمیق اثر کے بھی قائل ہیں۔

فیض نے ابتدا غزل گو کی حیثیت سے کی اس نے غزل کو محض صنفِ سخن کی حیثیت ہی

سے اختیار نہ کیا، بلکہ اس میں تھوڑی سی تازگی اور شگفتگی کا اضافہ کر کے اس کی قدیم اور روائتی علامات اور تصورات کو برقرار رکھا۔ اس کی غزلیں بہت حد تک قدیم شاعروں کے خیالات ہی کی بازگشت ہیں، جیسے کہ ہر اچھی غزل کو ہونا چاہیئے۔ اپنی ابتدائی نظموں میں فیضؔ ایک لورنڈ واحسن پرست اور انحطاط کا دلدادہ شاعر نظر آتا ہے۔ خود مجھ پر اور غالباً ہماری پود کے اکثر شاعروں پر ایسا ہی زمانہ گذرا ہے۔ ہم میں سے بعض اس دلدل سے جلد باہر نکل آئے ہیں۔ اور بعض ابھی اسی کے اندر ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ فیضؔ کی اس زمانے کی نظمیں حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔ زندگی سے ان کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ زندگی میں اور ان میں ایک خلیج حائل ہے، ذاتی حسن پرستی کی خلیج، جسے فیضؔ عرصے تک پار نہیں کر سکا۔ "انتہائے کار" "انجام" اور "سرودِ شبانہ" اس نوع کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں شاعر خود اپنے ساتھ سرگوشیاں کرتا سنائی دیتا ہے۔ "تنہائی میں یہی سرگوشیاں زیادہ پُر اسرار، زیادہ فریب انگیز ہو گئی ہیں۔ ان نظموں کے مصرعے رینگ رینگ کر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا تار و پود مکڑی کے جالے سے زیادہ استوار اور بکار آمد نہیں۔ ہر ہر لفظ پر احساسات ایک بوجھ، ایک کابوس بن کر چھائے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں فیضؔ نے جو بحر (فاعلاتن مفاعلن فعلن) سب سے زیادہ استعمال کی ہے وہ تمام بحروں سے زیادہ کاہل، نرم رو اور خواب آلود ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے فیضؔ کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کی آخری چند نظمیں مثلاً "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"۔ "موضوعِ سخن"۔ "انتباہ"۔ "تسلی"۔ وغیرہ اس جسمانی اور ذہنی کشاکش کا پتہ دیتی ہیں جس میں ہماری پود مبتلا ہے۔ یہ نہیں کہ فیضؔ نے عمداً رومان پرستی کو خیرباد کہہ کر نام نہاد ترقی پسند راستہ اختیار کر لیا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے خیالات کی پختگی کے ساتھ ساتھ وہ غلطاں غلطاں احساسات کی نئی دنیا میں چلا گیا ہے۔

جہاں سائے زیادہ گہرے اور زمین زیادہ سنگلاخ ہے فیض شروع سے ان چیزوں کا دلدادہ رہا ہے، جن کو اس کے حواس براہِ راست دیکھ سکتے، سن سکتے اور چھو سکتے ہوں۔ لیکن وہ زندگی کے حسین اور رقت انگیز پہلو کے سامنے ہمیشہ ذکی الحس رہا ہے۔ اس کا متخیلہ اس کی ذات کے گرد، اس کے اپنے ماضی، اپنے مستقبل کے گرد گھومتا رہا ہے طبیعت کی افتاد نے غالباً اسے مرئی حسن سے ہٹا کر مرئی بدصورتی میں سے لذت اخذ کرنے کی طرف مائل کر دیا ہے۔
اب اس کے تأثرات محض ہوا کے جھونکوں کی طرح اس کے جسم کو چھو کر نہیں گزر جاتے بلکہ اس کے سینے میں جاگزیں ہو کر دیر تک غم اور غصہ کی لہروں کو بھڑاتے رہتے ہیں، اس کی بحروں میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی ہے۔ اب وہ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن اور مفعول فعولن فعلاتن وغیرہ قسم کی زیادہ سبک زیادہ متحرک اور زیادہ تند بحروں کا دلدادہ ہے۔ اب اس کی تصویریں محض آئینہ خانے کے عکس نہیں، بلکہ ایک ہاری ہوئی لٹی ہوئی تہذیب کے نئے سرے سے جنم لیتے ہوئے مجسمے ہیں، جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنی حیاتِ نو کے خوابوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فیض عمداً روایت کا باغی شاعر نہیں۔ اس کے ہاں قاتل اور رقیب کی سی فرسودہ علامات بھی نظر آتی ہیں۔ اس نے بحروں اور قافیوں اور ہیئتِ سخن میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں کی، لیکن اس کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ اس کی شاعری قدیم شاعری سے بالکل علیحدہ بالکل مختلف نظر آتی ہے ہمارے قدیم شاعر دراصل حسن کے احساس سے بہت حد تک بے بہرہ تھے۔ وہ اپنی جنسی الجھنوں میں اس قدر گرفتار تھے، کہ حسن ان کے لئے فی الواقع ایک نہایت سطحی اور ناقابل توجہ چیز تھی۔ انہوں نے یوں تو انسانی جسم کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ لیکن حسن کے نازک، لطیف اور دل دوز احساسات تک ان

کی رسائی نہ ہو سکی۔ انہوں نے روایتی علامات اور تشبیہات پر بیشتر خلوصِ اظہار کو قربان کیا۔ تجزیہ کرنے سے ہمارے قدیم شاعر کی دنیا بے حد زشت اور کرخت نظر آتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ حاضر کے نوجوان شاعروں میں سے فیضؔ ہی تنہا شاعر ہے جس کے ہاں جنسی الجھنوں کے آثار سب سے کم ملتے ہیں۔ فیضؔ اپنے تصورات سے اپنے لئے خالص حسن کا ایک دلکش بہشت پیدا کرنا جانتا ہے۔ خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں، رخساروں کے عشرت آلود غازے، سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیا، مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں، مخملیں بانہیں، رنگین پیراہن، دمکتے ہوئے رخسار اور جھلکتے ہوئے آنچل اس کی دنیا میں بار بار آتے ہیں، وہ انہیں الفاظ کے مجموعے سے ایک حسینۂ خیال کا مجسمہ تعمیر کر دیتا ہے، پھر اس حسینہ کو کسی نیم تاریک نیم خواب شبستاں میں بٹھا کر اس سے اپنا انتظار کراتا ہے، اس کے لبوں پر دعائیں اور التجائیں چسپاں کراتا ہے، اس کی نگاہوں کی ناصبوری پر رحم کھاتا ہے، اس کی تھکاوٹ اس کی اداسی اور اس کی تنہائی کے بوجھ سے چور جوانی سے لذت کا اکتساب کرتا ہے، خود اس کے قریب دبے پاؤں آ آ کر ہٹ جاتا ہے، تاکہ وہ طلسم جس کے ریشمی تاروں سے یہ دنیا آویزاں ہے، دفعتاً ٹوٹ نہ جائے۔ فیضؔ کی ابتدائی شاعری اس طلسمی حقیقت سے گریز کی داستان ہے۔ اس کے مطمحِ نظر اور حقیقت کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج سی حائل رہتی ہے۔ جسے وہ عبور کرتے ہوئے جھجکتا اور کانپتا ہے۔

لیکن وہ اس خلیج کو پاٹنے میں بالکل ناکام بھی نہیں رہا۔ اس نے حسن اور رومان کے سنہری پردوں کے اس پار حقیقت کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ اس نے آرزوؤں کے مقتل، بھوک اگانے والے کھیت، خاک میں لتھڑے اور خون میں نہائے ہوئے جسم، بازاروں میں بکتا ہوا مزدور کا گوشت، ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب دیکھ پائے ہیں۔ دلوں کی

بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار سُن پائی ہے۔ اجنبی ہاتھوں کے بے نام ستم کی گرانباری محسوس کر پائی ہے ناسوروں سے بہتی ہوئی پیپ کی بدبو سونگھ لی ہے۔ دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق کی حسرتِ مرگ کا جائزہ کر لیا ہے۔ حقیقت کی اس بے نقابی پر اس کی بعض نظموں میں جذبات کا سیلاب پھوٹ پڑا ہے۔ فیض میں غیظ کی فراوانی اور تندی نہیں۔ وہ اپنے جذبات کی بے پناہ شدت کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے جذبات کے خلوص کے ساتھ خود ضبطی کا وہ جوہر عطا ہوا ہے، جو اس کے غصے کو ایسا شعلہ نہیں بننے دیتا جو بھڑک کر خاموش ہو جائے بلکہ جذبات کی ایک دبی ہوئی چنگاری کہیں آہستہ آہستہ سلگتی رہتی ہے اس خود ضبطی کے طفیل وہ اپنی (تسلی) میں اپنے غصے کو بہتر دنیا کے مخملی خواب میں چھپا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے"

چنانچہ اپنی فن کاری کے اس خاص حربے سے وہ غم و غصے کی انتہا کو بھی یاس کا طوفان نہیں بننے دیتا۔ وہ عہدِ جدید کی "شیطنت" کو ضرور عریاں کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا تخیل مرئی حقیقتوں کے رو در رو ہو کر ان پر طعن کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ ان حقیقتوں کو خواب میں منتقل کر کے انہیں حسن کی پوشاک پہنانا جانتا ہے۔ اس خواب آفرینی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نظموں کے بعض ٹکڑے سخت گھناؤنے ہونے کے باوجود دلکش ہوتے ہیں وہ عہدِ حاضر کے عفریت کے سینے میں اپنا تیر گاڑتا ہے، لیکن زیادہ گہرا نہیں، اتنا گہرا نہیں کہ وہ ایک سسکی لئے بغیر چل بسے۔ وہ حقیقت کے دل تک پہنچنا چاہتا ہے، لیکن اس کا دل برمانے سے کنیاتا

ہے۔ اسی لئے اس کی بعض نظموں میں حقیقت کے نفرت آلود چہرے پر غازے کی چمک باقی رہ جاتی ہے۔ جو غنائیت اور تغزل کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اسے عہدِ حاضر کی عالمگیر شیطنت سے وحشت اور کراہت ہے لیکن اس وحشت اور کراہت کو یک دم تباہ کرنا اسے منظور نہیں معصیت کے دور تک پھیلے ہوئے جالوں اور ظلم کی بے پناہ زنجیروں کا خیال اسے بیتاب رکھتا ہے۔ جو ایک انسان کے جسم پر نہیں، دس انسانوں کے جسم پر نہیں بلکہ ساری انسانی دنیا کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جکڑے ہوئی ہیں۔

"تو اگر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے"

یا

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے۔
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے"

احساس کی تلخی ان اشعار میں اپنی پوری شدت پر ہے، یہاں تک کہ فیضؔ کے ذہن میں بسی ہوئی موسیقی بھی اس تلخی کو مٹا کر ان الفاظ کو خالی تغزل میں تبدیل کرنے

کی ہمت نہیں رکھتی۔

اس تلخی میں بے صبری بلکہ خفقان کا وہ اثر پایا جاتا ہے جو ہمارے زمانے کا طرۂ امتیاز ہے فیض غالباً ہمارے تمام موجودہ شاعروں سے بڑھ کر تاریخ کی بے پناہ قوتوں کا شعور رکھتا ہے۔ اس لئے کبھی تو وہ اس چار طرف چھائی ہوئی شیطنت اور نا انصافی کا مجرم اجنبی ہاتھوں کے ستم کو قرار دیتا ہے کبھی ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم میں اس کا راز تلاش کرتا ہے اور کبھی اسے اجداد کی میراث سمجھ کر بے بسی کی حالت میں خاموش ہو جاتا ہے فیض کی یہ آخری زمانے کی شاعری میرے نزدیک اس نفسی الجھن کی بہترین مثال ہے جسے (OEDIPUS COMPLEX) کہتے ہیں۔ یہ الجھن شاید ہم سب میں ہے اور عہدِ حاضر کے جس شاعر میں نہیں، وہ اپنے اردگرد کے سماجی اقتصادی اور سیاسی انقلاب سے بے بہرہ ہے۔ ہماری موجودہ تہذیب ماضی کی روایت سے اس قدر بیگانہ اور اس سے اس قدر مختلف ہوتی جا رہی ہے کہ ہم اپنے دکھوں کو اپنے اجداد کی میراث سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ جب عشق کسی خیالی صورت کی دریوزہ گری کرنا اپنی توہین سمجھتا ہو جب وہ ظلم سہتے ہوئے اور پائندہ غلامی میں کراہتے ہوئے انسانوں کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہو تو رقیب یا تو "اجنبی" ہے یا ان گنت صدیاں ہیں یا پھر ہمارے بدنصیب اجداد!

لیکن فیض کی نظم کا موضوع خواہ کوئی رومان ہو، خواہ زندگی کی کوئی سنگین حقیقت اس کا طریقِ کار، اس کی تکنیک ہر جگہ ایک سی رہتی ہے۔ اور برسوں میں بھی اس میں کوئی زیادہ نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ فیض ہمارے زمانے کے بعض دوسرے شاعروں کی طرح تشبیہات کا دلدادہ نہیں۔ اگر آپ اس کی نظموں کو غور سے دیکھیں تو شاذ ہی آپ کو کوئی تشبیہ ملے گی۔ کہیں بھی وہ کسی لفظ کا مفہوم سمجھانے کا یا کسی چیز کی تصویر

پیش کرنے کے لئے کوئی اس سے بڑھ کر انجانی اور نامعلوم چیز اپنے قاری کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ وہ صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، جو دل کر تاثر کے تاروں میں ایک شدید لیکن پائدار لرزش پیدا کر دیں۔ اس نے اپنی بعض ابتدائی نظموں مثلاً "نذرِ نجوم" "ایک منظر" اور "سرودِ شبانہ" میں اسی قسم کی کاریگری سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کی نظم "تنہائی" اس نوع کی صناعی کی غالباً بہترین مثال ہے۔

"پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا"

مجھے بارہا خیال آیا ہے کہ شاید یہ نظم بھی کسی سیاسیات میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہو۔ کیا راہرو سے مراد کوئی نیا حملہ آور ہے؟ کیا تاروں کا ڈھلتا ہوا غبار اور ایوانوں میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغ ہماری تہذیب اور مذہب کے بکھرے ہوئے شیرازے کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ اور کیا اجنبی خاک میں قدموں کے سراغوں کے دھندلا جانے سے شاعر کا یہ مطلب ہے کہ اس سرزمین نے جہاں ہم صدیوں پہلے ایک ہنگامہ ایک

ہاتھ ہولے کر آئے تھے، آج اپنی ناگوار آب و ہوا اور اپنے ناپسندیدہ ماحول سے ہمیں زوال آمادہ قوم بنا دیا ہے؟ لیکن شاید اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہوگا۔ اس نظم کی کامیابی تو اس کی مجرّد تاثیر ہی میں مضمر ہے۔ اس نظم کی پشت پر شاعر کے ایک بے پایاں ذہنی تجربے کا پتہ چلتا ہے جس ذکی الحس شخص کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی اداس اور غمناک شام بسر کرنے کا تجربہ ہوا ہو، اسے اگر اس نظم کے مطالعے سے تنہائی کا بوجھ ایک سنگِ گراں کے مانند اپنے کندھوں، اپنے جسم بلکہ اپنے سارے وجود پر محسوس ہونے لگے، تو یہ نظم یقیناً ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔ فیض کسی مرکزی نظریئے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے اور اپنے شدید احساسات کو وہ اپنے حسین الفاظ کے ساتھ اس طرح پیوست کرتا ہے کہ ایک ہی پیرہن کے تار و پود معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ن۔م۔راشد

دہلی۔ ۱۵ رنومبر ۱۹۴۱ء

۱

برواے عقل و منہ منطق و حکمت در پیش
کہ مرا نسخۂ غمہاۓ فلاں در پیش است

(عُرفیؔ)

اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

(۲)

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج

ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی

اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج

خدا وہ وقت نہ لائے ......

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے

تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے

تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے

غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا

ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے

وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے

ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے

غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے

تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے

خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے

فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لئے بیقرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

غزل

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

ہو چکا عشق! اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

تو ہے اور اک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیٔ امید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

انتہائے کار

پندار کے خوگر کو

ناکام بھی دیکھو گے؟

آغاز سے واقف ہو

انجام بھی دیکھو گے؟

رنگینیٔ دنیا سے مایوس سا ہو جانا

دکھتا ہوا دل لے کر تنہائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظروں کو

حسرت سے جھکا لینا

فریاد کے ٹکڑوں کو

آہوں میں چھپا لینا

راتوں کی خموشی میں چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے ملبوس کو دھو لینا
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو سینے سے لگا لینا

میں دلفگار نہیں تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں

اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے

سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں

تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں

تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

سرودِ شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنالیں ہم
آ محبت کے گیت گالیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرت دید ناتمام رہے؟
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کرلیں ہم
زندگی زرنگار کرلیں ہم

غزل

عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں

تیری رنجش کی انتہا معلوم!
حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازۂ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسمِ دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیضؔ زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے
جب درد سے رُک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گذر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بیکار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی　　اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے　　نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی　　شاید مری بےسود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہو گا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہو گا

القصّہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم　　یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ اُلفت

غزل

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے
بے کسی کارساز ہو جائے

منتِ چارہ ساز کون کرے؟
درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں
جَور تا حدِ ناز ہو جائے

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

سوچتا ہوں غمِ فردا نہ ستائے گا مجھے
اور دِل یوں غمِ دوراں سے نہ گھبرائے گا
تو جو آئے گی مرے پیار کی رانی بن کر
دِل افسردہ و بے تاب بہل جائے گا

سوچتا ہوں مری تخئیل کی پرواز ہے تُو
تیرے ہی پیار سے آباد ہے دُنیا میری
تو مرے گیت کی ہر لے میں چھُپی بیٹھی ہے
دل کے ہر گوشے میں تصویر نہاں ہے تیری

سوچتا ہوں یہ زمانے کا مزاجِ برہم
ایک مفلس سے تجھے پیار بھی کرنے دے گا
بحرِ آلام و حوادث کا یہ خُونی گرداب
کیا مرے پیار کی کشتی کو ابھرنے دے گا

نیند

مجھے بھٹکنے کی ترغیب دے رہے تھے سبھی

تری نظر سے بہت دُور ہے مقام ترا

تری تلاش میں بھٹکے گی خود ہر اک منزل

تری تلاش میں نکلے گا خود جہانِ نمُود

ذرا خیال کی وسعت میں جھانک کر تو دیکھ

ترے خیال کی دُنیا ہے دوست لامحُدود

نہ جانے کون سی دُنیا کی آرزو لے کر

چلا تھا میری اُمنگوں کا کاروانِ حیات

مگر یہ کیا کہ جنوں میں پہنچ کے منزل تک

مجھے خیال یہ گزرا کہ مَیں نے کھائی ہے مات

یہ شور اُٹھا کہ وہی ہے نظامِ تیرہ و تار

ابھی تو جاگتی آنکھوں میں نیند ہے بیدار

ابھی تو رات پڑی ہے پڑاؤ ڈالے ہوئے

ابھی ہیں دُور بہت دُور صُبح کے آثار

نگل رہے ہیں اندھیرے افق کی سُرخی کو

ہر ایک سمت نظر آ رہی ہے ظلمتِ یاس

دل و دماغ پہ افسردگی سی طاری ہے

مرے شعور کی پلکیں ہیں نیند سے بوجھل

اجنبی

اُلجھ رہے ہیں خیالوں کے راستے باہم
تری نظر میں نہیں میری مشکلوں کا حل

مجُھے نہ چھیڑ کہ اب نیند آرہی ہے مجُھے
تھپک تھپک کے سحر خود سُلا رہی ہے مجُھے

•

موڑ

وقت کی نبض کس نے پہچانی

وقت کی نبض کون پہچانے

تُو مری راہ میں نہ ہو حائل

تیری منطق کا میں نہیں قائل

تیری فطرت فریب سازی ہے

میری فطرت جنوں نوازی ہے

اجنبی

فہم و ادراک کی حدوں سے پرے

میری منزل پکارتی ہے مجھے

راستہ چھوڑ مجھ کو جانے دے

میری ہستی کو کام آنے دے

ورنہ یونہی بنیں گے افسانے

وقت کی نبض کون پہچانے

عقل سود و زیاں کی سودائی

وائے معراج کے تمنّائی

چھوڑ اپنی یہ فلسفہ دانی

وقت کی نبض کس نے پہچانی؟

میں رہِ مصلحت سے باز آیا

وقت کی راگنی سے بھر پایا

گاندھی

اب وہ غمازِ زندگی ہے کہاں

اب وہ اسرارِ آگہی ہے کہاں

مسکراتا ہوا وہ مفتیٔ دیں

تھا تمھے غم کا پاسدار و امیں

جس سے دل کے چراغ روشن تھے

جس کے دم سے دماغ روشن تھے

جس نے تیرے ملال کو سمجھا

جس نے تیرے سوال کو سمجھا

جس نے تیرا وقار پہچانا
جس نے تیرے خلوص کو جانا
جو حوادث میں مسکراتا تھا
ہر نفس تیرے گیت گاتا تھا

جس نے توڑا طلسمِ فکرِ فرنگ
بخش دی جس نے زندگی کی امنگ
جس نے سب ظلمتیں مٹا ڈالیں
جس نے شمعیں عمل کی روشن کیں

جس نے رازِ حیات سمجھایا
جس نے مہر و وفا کو اپنایا

تیری شفقت کو ناز تھا جس پر

مادرِ ہند وہ سپوت ترا

زندگی کا جسے نقیب کہیں

بے بسوں کا جسے حبیب کہیں

جس نے اپنے لہو کی سرخی سے

ترے خاکوں میں رنگ بھر ڈالا

جس نے پرچم ترا بلند کیا

خون ہم نے اسی کا کر ڈالا

پشیمانی

کیا کہوں تجھ سے اے رفیقِ حیات

مَیں نے تیرے لئے کیا کیا ہے

تیری معصوم آرزوؤں کو

رنج و غم کے سوا دیا کیا ہے

جن سے آباد تھیں تری نیندیں

کیا ہُوئے وہ ترے اچھوتے خواب

سوچتا ہُوں کہ کیا کہوں تجھ سے

میری ناکامیاں ہیں اس کا جواب

تیری غم آشنا نگاہوں میں
غمِ امروز سے دھندلکے ہیں
میں سمجھتا ہوں اُن سوالوں کو
تیرے ہونٹوں پہ جو تھرکتے ہیں

تُو نے سوچا تھا پیار کی دُنیا
عیش و عشرت کی نغمہ خواں ہوگی
تیری جھانجھر کی جھن جھنا جھن جھن
میرے گیتوں کی ترجماں ہوگی

میری خاموشیوں کے پردوں میں
تیری ہر بات کا جواب بھی ہے
میں اگر کُشتۂ حقائق ہوں
تیری آنکھوں میں کوئی خواب بھی ہے

اُردو

تجھ سے جو گیت وراثت میں ملے ہیں مجھ کو
آج وہ گیت مرے درد کی آواز بنے
اور آواز وہ آواز کہ جس کی جھنکار
نغمۂ شوق بنے شوق کی غماز بنے

مجھ کو احساس بھی ہے وقت کی بے مہری کا
پھر بھی میں وقت سے مایوس نہیں ہوں اتنا
مجھ کو جینا ہے ترے حسن کا پرتو بن کر
ظلمتِ دہر میں محبوس نہیں ہوں اتنا

مَیں نے وہ گیت تراشے ہیں کہ دنیا جن سے
خودُ ترے حسُن کی تصویر سمجھ جائے گی
مَیں نے وہ خواب لسائے ہیں تری نیندوں میں
اپنے خوابوں کی وہ تعبیر سمجھ جائے گی

توُ نے سونپی ہے جو نغموں کی امانت مجُھ کو
کیوں نہ اُن نغموں کو مَیں بربطِ دل پہ گاؤں
کیوں نہ سرمایۂ اسلاف پہ ہو ناز مجھُے
کیوں نہ اُن نغموں کو افکار کی معراج کہوں

تجُھ سے قائم ہے مرے فکرِ سخن کی تابش
تجُھ سے زندہ ہیں مرے گیتوں کے جذباتِ حسُیں
مائلِ شرحِ اشاراتِ محُبّت ہے دماغ
اور ترے حسُن سے تابندہ مرا ذوقِ یقیں

زندگی

چشمِ بے خواب کی بھرپور اداسی پہ نہ جا
ان میں کیا خواب نہیں، خواب کی تعبیر نہیں
میرے ماضی کی مرے حال سے کڑیاں نہ ملا
میرا ماضی تو مرے حال کی تصویر نہیں

کیا ہوا غم سے جو بیگانہ نہیں فکرِ حزیں
وقت رکنے کا نہیں، روک کے دیکھے کوئی
اور کچھ گردشِ ایام سے ہونے کا نہیں
پھر تو کیا سوچ کے اے چشمِ تخیل روئی

جن سے روشن ہیں خیالوں کی اندھیری گلیاں
جن سے آباد ہیں افکار کے بہتے دھارے
ہے مری سوچ کے آکاش کی جن سے سج دھج
ٹمٹماتے ہیں وہ یادوں کے بجھیلے تارے

جس سے گل رنگ ہے گل پوش ہے دل کی وادی
ہے وہ ناسور مری فکر کے سینے کی دھنک
ہے مرے درد سے وابستہ ہر اک ساز کی لے
ہے مری چپ میں ہر اک ساز کی خاموش کھنک

زندگی ہے کہ سلگتے ہوئے سگرٹ کی طرح
دم بدم راکھ کی صورت میں ڈھلی جاتی ہے
اور احساس کے پرسوز دھویں کی یہ لکیر
جانبِ وادیِ گمنام چلی جاتی ہے

انتشار

قدم قدم پہ کئی نقش بنتے مٹتے ہیں
ہر ایک سانس مرا مجھ سے خود الجھتا ہے
مجھے غرور نہ تھا اپنی آگہی پہ کبھی
مرا شعور، مرا ذہن کیوں سلگتا ہے

اجنبی

یہ زندگی میں خیالوں کی ناچتی پریاں
یہ میری تشنہ اُمیدوں کے جاوداں پیکر
کھڑی ہیں راستہ روکے ہوئے وُہی میرا
جواں کیا تھا جنہیں دل نے اپنا خُوں دیکر

میں جانتا ہوں انہیں مجُھ سے کیا عداوت ہے
یہ مینکائیں مجھُے کس لئے لبھاتی ہیں!
جو بے نیازی مری بزدلی نے برتی تھی
وہی حدیثِ گذشتہ مجھُے سُناتی ہیں

میں رنگ بھرتا رہا آپ اپنے خاکوں میں
مجھُے یقیں تھا یہ خاکے کبھی جواں ہونگے
مجھُے تو وہم بھی گزرا نہ تھا کبھی اس کا
کہ میرے خواب کبھی مجھ سے سرگراں ہونگے

اجنبی

نہ پاسکوں گا کبھی منزلِ تجسس کو
نفس نفس پہ ہنسے گا سراب منزل کا
نہ چھو سکیں گے مرے پاؤں منزلوں کو کبھی
قدم قدم پہ ستائے گا خواب منزل کا

میں آ گیا ہوں یہاں کس کی رہبری کے طفیل
میں سوچتا ہوں مگر سوچ کچھ بتائے بھی
یہ بہری گونگی رفیقہ کا ساتھ نبھ جائے
خدا کرے یہ کسی طرح لب ہلائے بھی

تجسس

لوگ آواز مری سنتے ہیں سر دھنتے ہیں
لیکن آواز میں خود اپنی نہیں سُن سکتا

چاہتا ہوں نہ سنوں کچھ نہ کسی سے بولوں
بات دل کی نہ کسی اور کے دل پر کھولوں
آج تنہائی بھی ہے یاس بھی ہے درد بھی ہے
جی میں آتا ہے دلِ زار کہ تجھ کو رولوں

اجنبی

ہائے یہ غم یہ اُداسی یہ سکُوتِ بیدار
سانس لیتی ہوئی یادوں کا گلا گھونٹ نہ دُوں
دشتِ احساس سے جس طرح بھی ہو جیسے بھی
ساتھ اُڑتی ہُوئی آواز کے میں بھی ہو لُوں

تاکہ پھر آئے نہ بربادیِ دل پر رونا
عہدِ رفتہ کی طرف فکرِ حزیں جا نہ سکے
کوئی تلخی سی نہ چھا جائے خیالوں پہ مرے
اور کوئی یاد ہی بھُولے سے مجھے آنہ سکے

آج فرصت ہے کسی سوچ کا دامن تھامے
میں کسی عالمِ گم گشتہ کی جانب چل دُوں
اک بگولے کی طرح دیکھ لُوں صحرا صحرا
میں ازل ہوں تو ازل ہو کے ابد کو پا لُوں

رقیب سے

اپنے آئینے میں تھا اُس نے تو خود کو دیکھا
اُس نے کب جانا تجھے اور تجھے کب سمجھا
محض بیمار شرافت کو بچانے کے لئے
اُس نے تو پیش کیا تجھ کو بنا کر سپنا

میری بیمار شرافت ہے مرے ذہن کی موت
اب مرے بس میں نہیں خود کو بھی دھوکا دینا
میرے لہجے میں نہیں لوچ، صداقت بھی نہیں
آج بیمار شرافت سے مجھے کیا لینا

میری معصوم اُمیدوں کے گھروندے جن کو
مَیں نے مر مر کے بسایا تھا اُجاڑا تُو نے
اور سینچا تھا جِسے اپنے لہُو سے مَیں نے
اُسی گُل برگِ تمنّا کو اکھاڑا تُو نے

ترا خوش رنگ تصوّر مَیں کہاں سے لاؤں
ترے اخلاص کے نغمات میں کیونکر گاؤں
تجھ سے وحشی کو درندے کو خدا شاہد ہے
اس سے پہلے کہ میں انسان کہوں مر جاؤں

ترے ہاتھوں میں جو خنجر ہے چلا دے بڑھ کر
مرے دِل پر مرے احساس کی اک اک رگ پر

غمِ پنہاں

ترے جلووں کی شفق رنگ شعاعیں لے کر
دیدہ و دل کے خلاؤں کو چھپاؤں کب تک
دل کے ویرانے میں آئی ہے نہ آئے گی بہار
گیت ان دیکھی بہاروں کے میں گاؤں کب تک

میں نے روشن کئے بے نور امیدوں کے دیئے
اور احساس کا ہر طاق سجائے رکھا
ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر میں نے
دل میں اک دردِ فسوں ساز بسائے رکھا

دل کے دروازے پہ آہٹ ہے نہ دستک ہے کوئی
شب کا دامن ہے کہ پُرہول خیالوں کا غبار
پھر بھی اُمید تری راہ تکے جاتی ہے
لے کے آنکھوں میں تجسّس کا سکوتِ بیدار

اب تو شب بھیگ چلی صُبح کا تارا نکلا
اے کہ میں محوِ فغاں گوش بر آواز بھی تھا
اب تو بے تاب اُمنگوں کو قرار آ جائے
میرے انجام کا شائد کوئی آغاز بھی تھا

میرے اس درد کے آغاز کے ہر عالم میں
تری تکمیل کا احساس فسُوں ساز رہا
ایک نقطے کی تمنّا تھی کہ بڑھ کر پھیلے
ایک نُکتے کا تجسس تھا جنوں ساز رہا

درِ زنداں جو کھلا

درِ زنداں جو کھلا ہم پہ تو ہم نے یارو
عرصۂ دہر کی مانوس ہواؤں سے کہا
ہم سے آؤ گی جو ملنے تو ہمیں پاؤ گی
شب کے سناٹے ہیں خاموش ہو جیسے صحرا

درِ زنداں جو کھُلا ہم پہ تو ہم نے یارو
ڈھلتے سُورج کی شعاعوں کو جو دیکھا تو کہا
رات آرام کرو تم بھی کسی گوشے میں
صُبح پھر ہم سے مُلاقات کو آنا ہوگا

درِ زنداں جو کھُلا ہم پہ تو ہم نے یارو
غالب و میر کی دِلّی سے بہ صد عجز کہا
نغمہ و شعر سے گرمایا تری گلیوں کو
تو نے اس پر بھی نہ اندازِ تغافل بدلا

درِ زنداں جو کھُلا ہم پہ تو ہم نے یارو
اپنے احباب کی خاموش نگاہوں سے کہا
آپ کی چشمِ عنایت کا نہیں ذکر یہاں
آپ کی بزم میں کچھ وقت تو اچھا گزرا

درِ زنداں جو کھلا ہم پہ تو ہم نے یارو
منصفِ شہر کے اندازِ تخاطب سے کہا
آپ ارشاد کریں جرم و سزا کی تفسیر
ہم نے جو کچھ بھی کیا سوچ لیا ٹھیک کیا

درِ زنداں جو کھلا ہم پہ تو ہم نے یارو
اپنے جذبات سے بھرپور ارادوں سے کہا
قرنہا قرن سے آئین کا پردہ اوڑھے
حق پرستوں پہ یونہی ظلم و ستم ہوتا رہا

محرومیت

دل کے صحرا میں ہیں جانے کتنے قدموں کے نشاں
کون جانے کہہ رہے ہیں کس سے کس کی داستاں
عشقِ خاکستر میں باقی ہے دھواں احساس کا
چھوڑ جائے جس طرح جلتا الاؤ کارواں

جاگ جاگ اُٹھتی ہے یوں سینے میں یادوں کی خلش
یاد آئے جس طرح رنگین بُوڑھوں کو شباب
آ گیا کچھ اس طرح مجھ کو خیالِ رفتگاں
جس طرح یاد آئیں شادی کے کسی بیوہ کو خواب
جس طرح خانہ بدوشوں کا ہو صحرا میں قیام
اس طرح ہیں کتنی یادیں میرے دل میں خیمہ زن
ہائے وہ جذبے مرے، جو تھے مجھے خود سے عزیز
ذہن کی پہنائیوں میں ہیں وہ لاشے بے کفن
جانے کتنے ہمسفر راہوں میں کٹ کر کھو گئے
جانے کس کس ہمسفر کی یاد میں رویا ہوں میں
رات بھر اُلجھا رہا تاروں کے دامن میں خیال
جانے کس وادی میں ڈوبا ہوں کہاں کھویا ہوں میں

سوچ

مری حیات کا انجام سوچنے والے
مری حیات تری سوچ کی نہیں محتاج

میں بے نیازِ غمِ زیست تو نہیں اے دوست
یہ اور بات مجھے زندگی ہی راس نہیں
بجا کہ آج نہیں کوئی میرا ہم آواز
بجا کہ آج زمانے کو میرا پاس نہیں

مری اداس نگاہوں میں جھانکنے والے
تری نظر سے تو پنہاں نہیں مرے حالات
یہ اور بات کہ تو بھی مجھے سمجھ نہ سکا
یہ اور بات کہ تشنہ ہے مرے جذبات

اجنبی

مَیں کائنات کو اپنا کبھی سمجھتا تھا
بہت عجیب تھا مری وفاؤں کا عالم
یہی وہ سادہ دلی تھی کہ آج تک جس کا
کیا بحالِ فسُردہ نفس نفس ماتم

مرا خلوص مری زندگی کا سرمایہ
جہانِ فکر و نظر نے کچھ ایسے ٹھکرایا
مرے شعور نے تنہائیاں گوارا کیں
مری "انا" نے خلاؤں میں مجھ کو اپنایا

مَیں جانتا ہُوں کہ مسلک ترا مروت ہے
یہی سمجھ کے تری بات سُن رہا ہوں آج
مری حیات کا انجام سوچنے والے
مری حیات تری سوچ کی نہیں محتاج
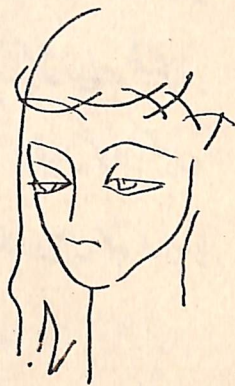
آپ کچھ سوچ کر ہنسے ہونگے

ہم تو بے وجہ مُسکرائے ہیں

اجنبی

غمِ حیات کی پُر ہول تیرگی سے نہ ڈر

مری اُمید کے ہاتھوں میں ہے خوشی کا چراغ

داورِ حشر ہے یہ گستاخی
بندہ ترے حضور منہ کھولے
صفحۂ دہر سے مٹا مجھ کو
یا مجھے مستقل جوانی دے

●

چپ تو تھے محوِ راز ہو جاتے
رنج سے بے نیاز ہو جاتے
دوستوں کا سلوک وہ نہ رہا
ورنہ ہم بھی مجاز ہو جاتے

اے غمِ زندگی فریب نہ دے
ہم نہیں عیش کے تمنائی
اپنی دُنیا ہے درد کی دُنیا
اور ہمراز ہے یہ تنہائی

•

اُن سے قطعِ تعلقات کے بعد
کس قدر محو ہو گیا ہُوں میں
اے غمِ عشق شُکریہ تیرا
اپنی ہستی میں کھو گیا ہُوں میں

فکرِ سود و زیاں میں گزری ہے
زندگی امتحاں میں گزری ہے
واردات جنون و ہوش نہ پوچھ
میری ہستی گماں میں گزری ہے

•

میرے ہونٹوں کی دل شکستہ ہنسی
تجھ کو رُودادِ غم سُنا نہ سکی
ایک بھرپور طنز ہے مجھ پر
میری نظروں میں زندگی اپنی

نغمہ و شعر کے تبسم کو

دوستو! ڈس رہا ہے وقت کا ناگ

زندگی غم ہی غم نہ ہو جائے

غم اگرچہ ہے زندگی کا سہاگ

•

جس طرح تیرگی کے عالم میں

دور کوئی چراغ جلتا ہے

اس طرح حال کے دھندلکوں میں

میرے ماضی کا نور ڈھلتا ہے

میرے دل کے اتھاہ ساگر میں
کتنے ہنگامے سانس لیتے ہیں
غم دیئے ہیں وہ زندگی نے مجھے
ہر خوشی کو جو مات دیتے ہیں

•

آرزوؤں کے جال بُن بُن کر
زندگی کے خلا کو بھرتے ہیں
دہر میں ایسے بھی لوگ ہیں موجود
جو نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں

عشق کو بے وقار دیکھا ہے
آرزوؤں کو خوار دیکھا ہے
کیوں مری فکر پہ گداز نہ ہو
حسن کو سوگوار دیکھا ہے

●

حسن کی آنکھ دلِ زار پہ بھر آئی ہے
ہم نے کیا ضبط و تحمل کی سزا پائی ہے
کاش رک جائے کہیں ایسے میں دل کی دھڑکن
ورنہ جینے میں تو اب اور بھی رسوائی ہے

بجھ گئے شوق ہی احساس کی بیداری سے

عقل بدنام ہوئی قلب کی غمخواری سے

زیست بے کیف ہوئی لمحہ بہ لمحہ اے دوست

عشق ناکام ہوا ذہن کی ناداری سے

●

چاند تاروں کی آرزو لے کر

نیند کی وادیوں میں کھو جائے

ہم جو بھولے تجھے تو یوں اے دوست

جیسے بچہ بلک کے سو جائے

ضبطِ گریہ کوئی مذاق نہیں!

غم گُساروں نے سادھ لی چُپ سی

اے غمو! تم ہی کوئی بات کرو

کتنی دلسوز ہے یہ خاموشی

●

زندگی کے وبال سے چُھوٹیں

آئے دن کے ملال سے چُھوٹیں

اے غمو! اب پناہ دو ہم کو

ہم خوشی کے خیال سے چُھوٹیں

گونج اٹھا کوئی ان سنا سا گیت

اپنے ہی نشے میں جو پنہاں ہو

یوں سنی اپنی دکھ بھری آواز

جیسے فطرت ہی اب غزلخواں ہو

●

بے کلی سی محیط ہے دل پر

ہم نے دیکھا تھا عشق کا سپنا

ایک دھندلا سا عکس باقی ہے

ہے عجب حال ان دنوں اپنا

یہ آگہی ہے مری یا ہے خُودفراموشی

نیازمند بھی ہُوں اور بے نیاز بھی ہُوں

جو بے نیازِ درد رہے عُمر بھر ندیم

وہ لذّتِ حیات سے کب آشنا ہوئے

یہ کہہ رہا ہے غمِ عشق بار بار مجھے
کسی کا راز ہوں میں کر نہ آشکار مجھے

خبر کسی کو بھری بزم میں نہ ہونے دی
بنا لیا تری آنکھوں نے رازدار مجھے

مری خوشی کے لئے تو اسیرِ غم رہ کر
نہ کر خدا کے لئے اور شرمسار مجھے

شمیمِ دوست تجھے یہ مذاق کیا سوجھا
قفس میں آ کے دیا مژدۂ بہار مجھے

اب اور مجھ میں نہیں تابِ جستجو باقی
کہاں چھپا ہے خدا کیلئے پکار مجھے

ہم کسے محرم بناتے زندگی کے راز کا
سُننے والا کون تھا اے دل تری آواز کا

جس کو سُننے کیلئے بے تاب تھے اہلِ خرد
دل نے چھیڑا ہے وہی نغمہ جنوں کے ساز کا

کیا ہوا جو کر دیا بے بال و پر صیاد نے
آسماں قائل بھی تھا میرے پر پرواز کا

پُوچھ کر دیکھیں یہ اربابِ جنوں سے اہلِ ہوش
کیا اثر ہوتا ہے دل پر حُسنِ فتنہ ساز کا

یہ سمجھ کر درد مجھ کو موت کا ہو خوف کیوں
مَوت میں ہے رازِ مُضمر زیست کے آغاز کا

شوق کو کامیاب کرتے ہیں

زندگانی خراب کرتے ہیں

اہلِ ہمّت جواں ارادوں کو

وقفِ صد انقلاب کرتے ہیں

ہم نے بخشا جنہیں غرورِ جمال

وہ ہمیں سے حجاب کرتے ہیں

دل کو وہ مے فروش آنکھوں سے

غرقِ موجِ شراب کرتے ہیں

تُو نہیں تو ترا تصوّر ہے

ہم اسی سے خطاب کرتے ہیں

دردؔ کے حالِ زار پر دیکھیں

کب توجّہ جناب کرتے ہیں

اجنبی

ہمارے عشق و محبّت کے راز، راز رہے

وہ بے نیاز نہ رہ کر بھی بے نیاز رہے

نکل پڑے مرے دل سے وہ مضطرب نغمے

جو آج تک مری فکر و نظر کا راز رہے

غمِ جہاں کی نہ کچھ فکر کر دلِ مایوس

کچھ اپنے غم کا ذرا تجھ کو امتیاز رہے

شکستِ دل سے یہ عقدہ بھی کھل گیا آخر

وہ نغمہ، نغمہ نہیں جو رہینِ ساز رہے

متاعِ درد کہاں جو غمِ حیات نہ ہو

غمِ حیات سے لازم ہے ساز باز رہے

حدیثِ دردِ محبّت سُنا نہیں سکتے

ہزار چاہو تمہیں ہم رُلا نہیں سکتے

رہِ طلب میں جو گُزرے ہیں حادثے دل پر

تمام عُمر انہیں ہم بھلا نہیں سکتے

یہ حادثاتِ مسلسل، یہ شورشِ طوفاں

چراغِ عزمِ محبّت بجھا نہیں سکتے

شکست خوردہ ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں

کہ بارِ زیست گراں ہے اُٹھا نہیں سکتے

مآلِ زیست کی جن کو خبر بھی ہو اے درد

فریبِ زیست سے دامن بچا نہیں سکتے

اجنبی

ہمارے عشق و محبت کے راز، راز رہے

وہ بے نیاز نہ رہ کر بھی بے نیاز رہے

نکل پڑے مرے دل سے وہ مضطرب نغمے

جو آج تک مری فکر و نظر کا راز رہے

غمِ جہاں کی نہ کچھ فکر کر دلِ مایوس

کچھ اپنے غم کا ذرا تجھ کو امتیاز رہے

شکستِ دل سے یہ عقدہ بھی کھل گیا آخر

وہ نغمہ، نغمہ نہیں جو رہین ساز رہے

متاعِ درد کہاں جو غمِ حیات نہ ہو

غمِ حیات سے لازم ہے ساز باز رہے

حدیثِ دردِ محبت سُنا نہیں سکتے
ہزار چاہو تمہیں ہم رُلا نہیں سکتے

رہِ طلب میں جو گزرے ہیں حادثے دل پر
تمام عمر انہیں ہم بھلا نہیں سکتے

یہ حادثاتِ مسلسل، یہ شورشِ طوفاں
چراغِ عزمِ محبت بجھا نہیں سکتے

شکست خوردہ ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں
کہ بارِ زیست گراں ہے اٹھا نہیں سکتے

مآلِ زیست کی جن کو خبر بھی ہو اے دردؔ
فریبِ زیست سے دامن بچا نہیں سکتے

جو مُردہ جسموں میں رُوح پھُونکے جو زندگی پر شباب لائے

تو گیت ایسا سُنا دے مطرب جو دہر میں انقلاب لائے

یہ ظلمتوں کے مہیب سائے جو بزمِ گیتی پہ چھا رہے ہیں

کوئی تو ان کا طلسم توڑے کوئی تو ان پر عتاب لائے

اُٹھا بھی دو اب نقاب رُخ سے حجاب کیسا کہ انجمن میں

بجُز ہمارے کوئی نہیں جو تمہارے جلوؤں کی تاب لائے

یہ مرے جوشِ جنوں کا عالم کہ خود بخود مُسکرا رہا ہُوں

جہاں میں ایسی کہاں مُسرت جو میرے غم کا جواب لائے

نہ درد پُوچھو اب ہمارا عالم کہ ضبطِ غم کی عنائتیں ہیں

ہمیں تو ہیں جو زباں پہ ہرگز نہ شکوۂ اضطراب لائے

بہ قدرِ ظرف ترا غم بھی میرے پاس نہیں
اسی لئے تو مسرّت بھی مجھ کو راس نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا محبّت نے
خودی کا پاس نہیں بے خُودی کا پاس نہیں

ترے نشاط کدہ کے یہ قہقہے یہ سرُود
بُرا نہ مان مری زندگی کو راس نہیں

سمجھ گیا ہوں میں جب سے حیات کے معنی
خوشی بھی راس نہیں مجھ کو غم بھی راس نہیں

غمِ حیات کی پُر ہول تیرگی کی قسم
کسی کی یاد کا پرتو بھی مرے پاس نہیں

نظر سے دُور ہوتے جا رہے ہیں
مگر نزدیک دل کے آ رہے ہیں

مسّرت کا اسے حاصل سمجھ کر
تمہارے غم سے دِل بہلا رہے ہیں

حیاتِ چند روزہ کے تقاضے
مسلسل دام بنتے جا رہے ہیں

خبر بھی ہے مآلِ دوستی کی
فریب دوستی بھی کھا رہے ہیں

ذرا اے گردشِ ایام رُک جا
کہ تیرے ساتھ ہم بھی آ رہے ہیں

باغِ ہستی میں مت بھول

کانٹوں کے ہمراہ ہیں پھول

اے دل آخر صبح تو ہو گی

کھینچ لے شب کتنا ہی طول

کانٹوں کو بھی چوما میں نے

پھول تو آخر تھے ہی پھول

میری اُن کی بات ذرا سی

کھینچ رہی ہے کتنا طول

کانٹوں میں دامن اُلجھا کر

چُن سکتے ہو چُن لو پھول

اپنا غم اپنا ہے لیکن

درد نہ دُنیا کے غم بھول

کلی کلی کے حسن کو نکھار دوں تو آئیے
عروسِ نو بہار کو سنوار دوں تو آئیے

ابھی تو ہے بہت کٹھن یہ زندگی کا راستہ
ابھی قدم قدم اسے سنوار دوں تو آئیے

بغاوتوں کے وہ دیئے جو بجھ رہے ہیں دم بدم
میں اُن کی روشنی ذرا نکھار دوں تو آئیے

بلند و پست کا خیال ہو نہ جس نظام میں
میں اُس نئے نظام کو پکار دوں تو آئیے

سسک رہے ہیں جو ابھی بشر کے دل میں ولولے
اُنہیں میں انقلاب پھر ابھار دوں تو آئیے

اس دل کی خطائے سادہ پر الزام نہ جانے کیا ہو گا
آغاز تو ہم نے دیکھ لیا انجام نہ جانے کیا ہو گا

اے راہِ طلب کے متوالے ہر سانس پیامِ منزل ہے
منزل کا تعین کیا معنی ہر گام نہ جانے کیا ہو گا

جب حال مرا افسردہ ہے بے کیف اُمیدِ فردا ہے
کل صُبح نہ جانے کیا ہو گا، کل شام نہ جانے کیا ہو گا

اے سیلِ حوادث رُک تو سہی اے شورشِ طوفاں تھم تو ذرا
ہر موج ہے قاصد ساحل کی پیغام نہ جانے کیا ہو گا

اے جانِ جہاں پازیب تری بے ربط سے نغمے گاتی ہے
یہ رقص رہا تو محفل کا انجام نہ جانے کیا ہوگا

نیند آنے لگی ہے تاروں کو اور رات نے پلکیں جھپکا لیں
اے دوست مرے افسانے کا انجام نہ جانے کیا ہوگا

جب زیست گناہِ آدم ہے اور اُس کی سزا ہے یہ دُنیا
اے دردو بھر ابنِ آدم پر الزام نہ جانے کیا ہوگا

•

قدم قدم پہ یہاں ہیں نگاہ کے دھوکے
فروغِ صبح کے پردے میں بھی تو رات ملی

اب نہ جادہ ہے، نہ رہبر ہے نہ کوئی منزل

خود کو پہچان لیا ہو کے جہاں سے غافل

لاکھ طوفان اُٹھیں لاکھ بگولے روکیں

ہم کو پہنچائے گا منزل پہ جنونِ کامل

جو بچا لائے تھے گردابِ بلا سے کشتی

کیا خبر تھی کہ ڈبوئے گا انہیں خود ساحل

حُسنِ فردا کے حسیں باغ دکھانے والو

آج کی بات کرو کل سے بھلا کیا حاصل

آج دعوےٰ ہے انہیں وقت کی نبّاضی کا

جو رہے وقت کی رفتار سے کل تک غافل

دردِ فطرت میں بشر کی ہے تصنُّع ورنہ

کوئی یکتائے زمانہ ہے نہ کوئی کامل

وہ مہر و ماہ، وہ انجم وہ روشنی نہ رہی
وہ کیا گئے کہ کسی شے میں زندگی نہ رہی

وفا و مہر کا مفہوم جس سے روشن تھا
وہ دوستی وہ محبّت وہ آگہی نہ رہی

تری نگاہِ کرم جس پہ بھی اُٹھی اک بار
غم و الم کی اُسے زیست میں کمی نہ رہی

غمِ حیات کے احساسِ دل شکن کی قسم
غمِ وفا نہ رہا دِل کی آگہی نہ رہی

ترے خیال سے قائم ہے زندگی کا جمال
یہ اَور بات کہ اب تجھ سے دوستی نہ رہی

دل میں کیا کیا ہے بات کیا کہیئے
کٹ رہی ہے حیات کیا کہیئے

جو خلش بن کے رہ گئی دل میں
وہ تمنا، وہ بات کیا کہیئے

جو غمِ زیست کو سنوار گئے
ہائے وہ حادثات کیا کہیئے

کچھ حسیں خواب، کچھ حسیں یادیں
عشق کی کائنات کیا کہیئے

تُند طوفاں میں جھلملاتی ہے
در حرد شمعِ حیات کیا کہیئے

اجنبی

مری حیات کے نغمے ہیں زندگی کے لئے

رہین ساز نہ ہوں گے یہ نغمگی کے لئے

مرے خلوص بھرے دل کو توڑنے والو

میں ہنس رہا ہوں فقط آپ کی خوشی کیلئے

بھلا دیا ہے ترے عشق میں زمانے کو

ترس رہا ہے جہاں میری دوستی کیلئے

غم حیات کی تخلیق ہے غم دُنیا

غم حیات مقدم ہے آدمی کیلئے

مری نظر سے جو دیکھو تو ظُلمتِ ماحول

بنے گی خود خس و خاشاک روشنی کیلئے

نگاہِ عشق نے بخشا ہے جن کو سوزِ دوام

وہ اہلِ درد ہنسے ہیں تری خوشی کے لئے

اجنبی

اگر کچھ حاصلِ پرواز ہوتا ۔۔۔ تو اوجِ نو کا میں غماز ہوتا

کسی کا راز میرا راز ہوتا ۔۔۔ تو اے دل زندگی پر ناز ہوتا

حجاباتِ نظر حائل نہ ہوتے ۔۔۔ تو دلِ وقفِ نگاہ ناز ہوتا

اگر وہ گوش بر آواز ہوتے ۔۔۔ ہر انغمہ رہینِ ساز ہوتا

خموشی ہی مری حائل تھی ورنہ ۔۔۔ زمانہ خود مری آواز ہوتا

اگر ہوتے نہ بیگانے وہم سے ۔۔۔ تو پھر کیا عشق کا اعجاز ہوتا

جنوں بھی کامراں ہوتا یقیناً

اگر دل بھی زمانہ ساز ہوتا

اجنبی

سلوکِ حُسن کچھ ایسا رہا ہے
مرا جذبہ پسِ پردہ رہا ہے
وہ رازِ اہلِ خرد کیونکر سمجھ لیں
جنونِ عشق جو سمجھا رہا ہے
تری خاموش آنکھوں کا تکلّم
مری بے تابیاں اپنا رہا ہے
ترے ہونٹوں کا ہلکا سا تبسّم
مرا دل اب سمجھتا جا رہا ہے
وہ کیا سمجھے متاعِ شادمانی
وفورِ غم سے جو گھبرا رہا ہے
ذرا اے گردشِ ایام رُک جا
مرا ماضی مجھے یاد آ رہا ہے

ہر کسی سے فریب کھایا ہے
پھر کہیں ہم نے خود کو پایا ہے

جذبۂ خود سری سلامت ہے
کوئی اپنا ہے یا پرایا ہے

ہائے نیرنگیاں محبّت کی
خود کو کھویا ہے تجھ کو پایا ہے

زندگی آگہی کا نام نہیں
ہائے کس وقت ہوش آیا ہے

موت جن کو شکست دے نہ سکی
زندگی نے انہیں مٹایا ہے

نغمۂ درد چھیڑنے والے
ہم نے ہر غم گلے لگایا ہے

میری ہستی زندگی کا ساز ہے　　میرا نغمہ وقت کی آواز ہے

بے مروت دوستوں کے فیض سے　　دوستی جو راز سو اک راز ہے

ایک شاعر کے تخیل کی صدا　　ہر دلِ مایوس کی آواز ہے

ہم خوشی کی آرزو کیونکر کریں　　دل ہمارا ہے کہ خود غم ساز ہے

تم غمِ دنیا پہ نازاں ہو بہت　　اور غمِ ہستی کو ہم پر ناز ہے

بر ربطِ احساس کے نغموں کی دھن　　اک دلِ برباد کی آواز ہے

زندگی تنہائیوں کی گود میں۔
کٹ رہی ہے درد کی غماز ہے

ہماری زندگی کیا زندگی ہے
خوشی حاصل ہے پھر بھی تشنگی ہے

تری چشمِ کرم کی آرزو میں
حیاتِ چند روزہ کٹ رہی ہے

بجز اس کے نہیں کوئی سہارا
ہمارا غم ہماری زندگی ہے

انہیں پہچاننے کی فکر میں ہوں
کہ جن سے مدّتوں کی دوستی ہے

چراغِ صبح کی مانند اب تو
چراغِ زندگی کی روشنی ہے

ہم آج دل کی بات بنائے ہوئے تو ہیں
یعنی متاعِ ہوش لٹائے ہوئے تو ہیں

اے قلبِ بے قرار سکوں کی تلاش ہیں
ہم اضطرابِ زیست کو پائے ہوئے تو ہیں

ضبطِ فغاں کہو کہ اسے سوزِ ناتمام
ہم دل ہیں ایک آگ دبائے ہوئے تو ہیں

اے جذبِ عشق کوئی بھی تجھ سا حسیں نہیں
اک شکل سی خیال ہیں لائے ہوئے تو ہیں

کب دیکھئے وہ آنکھ حقیقت ہیں ڈھال دے
ہم خود کو اک فسانہ بنائے ہوئے تو ہیں

اے دردِ ہم سے دہر کی وابستگی نہ پوچھ
ہم ہر کسی کی آنکھ ہیں آئے ہوئے تو ہیں

کرم جس کو سمجھتے ہیں ستم ہے
یہ اُلفت کا بھرم کیسا بھرم ہے
عنایت ہے، نوازش ہے، کرم ہے
دلِ خود دار یہ کیا کیا ستم ہے

نہ تھا جن کو گوارا قربُ میرا
مری تنہائیوں کا اُن کو غم ہے
مری خاموشیوں کے تذکروں میں
مری بربادیوں کا ذکر کم ہے

اُنہیں معلُوم کیا معراجِ ہستی
جنہیں اپنا نہیں اوروں کا غم ہے
لبوں پر مسکراہٹ آنکھ پُر نم
مذاقِ عشق کیا یہ ضبط کم ہے

ہو بُرا شوقِ کامرانی کا
بڑھ گیا دردِ زندگانی کا

کِس طرح اپنے دل کو سمجھائیں
کیا کریں تیری بدگمانی کا

جو غمِ دہر سے عبارت ہے
زیست عنواں ہے اُس کہانی کا

تھا گماں خواب کا حقیقت پہ
وہ بھی عالم تھا نوجوانی کا

دل کی ہر واردات پر سوچا
ہم کو عنواں نئی کہانی کا

غم سے اے دردِ کس لیے گھبرا گئیں
غم تو جادہ ہے شادمانی کا

اے خرد کے متوالو کیا یہی ہیں فرزانے

جن کی بات سُن سُن کر ہنس رہے ہیں دیوانے

وقت کی نوازش ہے آج ملتفت ہیں وہ

جن کی بے رُخی کے ہم کہہ رہے تھے افسانے

آپ کے تصوّر سے آپ کی جُدائی میں

ہم پہ کیا گزرتی ہے، آپ کی بلا جانے

چاند کے نکلتے ہی درد جاگ اُٹھتے ہیں

اور دل کی بے تابی ڈھونڈتی ہے میخانے

وقت کے شناساؤ، خود پہ ناز فرماؤ

آ رہے ہیں دیوانے آپ ہی کو سمجھانے

فکر ہی نہیں سب کچھ زندگی عمل بھی ہے

عقلِ نکتہ چیں سُن لے اہلِ دل کے افسانے

سکوتِ غم جاوداں ہو گئے ہم

ترے عشق کے رازداں ہو گئے ہم

اُدھر بدگماں ہم سے وہ ہو رہے ہیں

اِدھر خود ہی وہم و گماں ہو گئے ہم

امینِ غمِ دوست ہو کر جہاں ہیں

حریفِ غمِ دو جہاں ہو گئے ہم

کہاں آرزوئے سکونِ دلِ زار

کہ اب تو سراپا فغاں ہو گئے ہم

تری کم نگاہی کا چرچا نہ ہوگا

دلِ زار کے ترجماں ہو گئے ہم

کہے کیوں نہ دُنیا کہانی ہماری

کہ تفسیرِ ضبطِ فغاں ہو گئے ہم

خوشا دردخوئے تغافل کہ آخر

اُسی آنکھ سے بدگماں ہوگئے ہم

•

اسیر کر نہ سکی جن کو بندشِ اوقات

مری حیات کا محور تھے بس وہی لمحات

اب سنائیں بھی تو کیا عشق کے افسانے کو
لوگ پہچان گئے آپ کے دیوانے کو

کس لئے گلشنِ برباد پہ حیراں ہو تم
پھول کھلتے ہیں مگر کھلتے ہیں مرجھانے کو

یوں تو سب تھے نگراں جانبِ ساقی لیکن
کس نے دیکھا تھا چھلکتے ہوئے پیمانے کو

ایک طوفان سا اٹھا ہے مرے سینے میں
ساقیا رقص میں لا آج تو پیمانے کو

پرسشِ دوست پہ گو حرف نہ نکلا کوئی
روک پائے نہ مگر آنکھ کے بھر آنے کو

اتنی خاموش فضائیں ہیں کہ دم گھٹتا ہے
کاش ٹکرا دے کوئی شیشے سے پیمانے کو

قطرۂ اشک ہے یا سوزِ نگاہِ برہم
جس نے کچھ رنگ دیا درد کے افسانے کو

•

ترے خیال کی سوگند تجھ سے غافل ہوں
مگر یہ دیکھ تری انجمن میں شامل ہوں

تری فکرِ پیش وبیں نے تجھے فلسفے میں ڈھالا

مری وحشتوں نے بڑھ کر ترا راز کھول ڈالا

ترا جور بھی ہے بے جا ترا لُطف بھی غضب ہے

ترے حُسن کا تکبّر مرے عشق نے سنبھالا

غمِ دہر نے جو سونپے مری زیست کو فسانے

مرے دِل نے خوُن دے کر انہیں شاعری میں ڈھالا

مری زیست سے طلب کی ترے حُسن نے مسّرت

مرے عشق نے عطا کی تجھے آنسوؤں کی مالا

تری آرزو کی دُھن میں، میں کہیں نکل چلا تھا

مری لغزشوں نے بڑھ کر مرے ذوق کو سنبھالا

کیسے جئیں گے ہم تنہا

یہ بھی تو سمجھاتا جا

ہم سے یُوں مت آنکھ چرا

جانِ تمنّا، جانِ وفا

عشق کی عظمت کا غماز

ہم نے اپنا دِل دیکھا

شوخیِ حُسن مُعمّہ سی

دردِ محبّت عقدہ سا

ہجر کی راتیں، ہجر کے دن

خاموشی اور سنّاٹا

ترکِ طلب، انجامِ طلب

پہلے نہ ہم نے سوچا تھا

زندگی کشتۂ الم تو نہ تھی
مے کبھی مرے حق میں سم تو نہ تھی

جانے کیوں ہم تجھے بھلا بیٹھے
خلشِ یادِ رفتہ کم تو نہ تھی

کیوں مری زیست تشنہ کام رہی
بے نیازِ نشاط و غم تو نہ تھی

دل ہی سرمستِ شوق تھا ورنہ
بے نیازی کسی کی کم تو نہ تھی

زندگی بھی سنوار لی ہم نے
یہ تری زلفِ خم بہ خم تو نہ تھی

جب کسی کا مقام دل میں نہ تھا
زندگی یوں اسیرِ غم تو نہ تھی

خوشی نصیب نہ ہو اور غم ہو بیگانہ
وہ بے نیازِ طلب ہو گا مجھ سا دیوانہ

تمہاری خوئے تغافل سے رہ کے بیگانہ
میں کر رہا ہوں مرتب غموں کا افسانہ

نگاہِ ناز تری بے نیازیوں کے نثار
مقامِ عشق کو ہم نے بھی آج پہچانا

مقامِ شوق سے آگے نکل گیا آخر
خودی کے زعم میں کوئی خودی سے بیگانہ

تری نگاہ نے ہر سمت دام پھیلائے

تُو ہی بتا کہ کدھر جائے تیرا دیوانہ

میں راز دانِ جنوں ہوں کہ راز دانِ شعُور

یہ میرے بس میں نہیں دوستوں کو سمجھانا

میں سوزِ عشق کی تفسیر بن گیا ہوں دردؔ

سُنے سُنے نہ سُنے کوئی میرا افسانہ

•

ہے محبت سے ارتقائے حیات

کون اہلِ خرد کو سمجھائے

تری بے رُخی میں مُروت سی ہے

تجھے مجھ سے شاید محبّت سی ہے

تری بے نیازی کا شکوہ نہیں

مجھے بھُول جانے کی عادت سی ہے

بتا اے محبّت تجھے کیا کہوں

انہیں آج مجھ سے شکایت سی ہے

کبھی تجھ کو پانے کی تھی آرزو

مگر اب بھُلانے کی حسرت سی ہے

کہاں آ سکی عشق میں یہ ادا

تری آنکھ میں کچھ مروّت سی ہے

بڑے کام کی ہے یہ بیگانگی

اُنہیں آج میری ضرورت سی ہے

کاش میں اک دیوانہ ہوتا
اپنی کہتا اور چپ رہتا

رنج و راحت شکر و شکوا
یہ بھی دھوکا وہ بھی دھوکا

دِل والو یہ دِل کا سپنا
ٹوٹ گیا تو پھر کیا ہوگا

میں راہی ہوں بھولا بھٹکا
ڈھونڈ رہا ہوں ساتھ کسی کا

بھر آئے ہیں آنکھیں آنسو
کیا تم نے کچھ دِل سے پوچھا

درد بڑی جب چوٹ سہی دل پہ
تب سمجھے ہم درد کسی کا

جنونِ عشق کو ہم کامراں بنا بیٹھے
متاعِ دیدہ و دل ہوش میں لٹا بیٹھے

تری تلاش کا حاصل ہے بے خودی اپنی
تری تلاش میں خود کو کہیں گنوا بیٹھے

دلِ شکستہ کی آواز کوئی سُن نہ سکا
یہی وہ غم ہے جسے دل سے ہم لگا بیٹھے

کسی کی یاد میں ڈوبے تو اس طرح ڈوبے
انہیں تو پا نہ سکے خود کو ہم بھلا بیٹھے

بھٹک نہ جائے رہِ غم میں قافلہ دل کا
ہم اک چراغ سرِ رہگذر جلا بیٹھے

ہم اضطرابِ مُحبّت میں کھا گئے لغزش
حدیثِ دَردِ مُحبّت اُنہیں سُنا بیٹھے

وہ بات جِس کا تعلق نہیں کسی سے بھی درد
نہ جانے سوچ کے کیا ہم انہیں سُنا بیٹھے

•

ہماری زندگی گاتی رہے گی
غمِ ہستی کو بہلاتی رہے گی

حال جو اُس نے پُوچھا ہوتا

اے دل سوچ تو پھر کیا ہوتا

عشق کا جادُو ایسا ہوتا

خود پر اُن کا دھوکا ہوتا

آنکھ کا ساغر چھلکا ہوتا

بوجھل جی کچھ ہلکا ہوتا

آنکھ میں آنسو جذب نہ ہوتے

حال جو اُس نے پُوچھا ہوتا

دُنیا تو دُنیا ہے مُورکھ

تُو نے خُود کو سمجھا ہوتا

اُن کو کھو کر خُود کو پاتے
کاش کہ اے دل ایسا ہوتا

اُن کا دامن چھُونے والے
اپنا ہاتھ بھی دیکھا ہوتا

منزل بڑھ کے قدم خود لیتی
کاش کوئی یُوں بھٹکا ہوتا

جیتے ہیں اور سوچ رہے ہیں
مرجاتے تو اچھّا ہوتا

مجھ سے کیوں خفا ہو تم کچھ مجھے بتاؤ تو
جان بھی میں دے دوں گا مجھ کو آزماؤ تو

ہو گئی جو ہونی تھی اب اُسے بھلاؤ بھی
بات کچھ سنو میری، اپنی کچھ سناؤ تو

عکس ہے کہ آئینہ آج دیکھ لوں میں بھی
میں ہوں یا تمہی تم ہو میرے دل میں آؤ تو

میں اگر فسردہ ہوں اور کچھ نہ سمجھو تم
کھل کھلا کے ہنس دوں گا تم ذرا ہنساؤ تو

شرط اگر ہے مٹ جانا میں خوشی سے مٹتا ہوں

جادۂ محبت میں تم مجھے مٹاؤ تو

ڈس رہی ہے تنہائی زندگی سسکتی ہے

تم کو دوست کہتا ہوں میرے غم بٹاؤ تو

فکر اور ارادوں پر بے حسی مسلط ہے

اب مرا بنے گا کیا کچھ مجھے بتاؤ تو

•

جنوں نواز طبیعت کی حوصلہ مندی

نگارِ وقت کے ہاتھوں پہ ہاتھ مار گئی

اپنے من کے بھولے پن پر مجھ کو رونا آئے
اندھی بہری دُنیا کو یہ اپنا درد سُنائے

گہرے ہوتے جائیں پل پل غم کے بڑھتے سائے
ڈھونڈ رہا ہوُں جیون کا پتھ کوئی راہ سُجھائے

پریم نگر کو جانے والے سُن لے راہ کٹھن ہے
دیکھ نہ تُو بھی میری طرح اس راہ میں ٹھوکر کھائے

من میں گہرے گھاؤ سہی فریاد نہیں ہے لب پر
غم کی دولت دینے والے تو سُکھ ہی سکھ پائے

وقت پڑے پر کوئی بھی تو کام نہ میرے آیا
دُکھ سُکھ دُنیا بھر کے میں نے جیسے ہوئے اپنائے

بھیگ چلی ہیں رات کی پلکیں جلنے لگے ہیں تارے
دیپک اور ملہار میں میں نے گیت بہت سے گائے

دلِ شکستہ کے تاروں کو پھر سے جوڑ دیا
فغاں کو ضبطِ فغاں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا

نہ جانے کون سی دُنیا کے خواب دیکھے تھے
یہ تم نے کونسی دُنیا میں لا کے چھوڑ دیا

مرے شعور نے جب جب کیا مجھے غافل
ترے خیال نے احساس کو جھنجھوڑ دیا

مری حیات کی محرومیوں کا ذکر نہ کر
کسی کی یاد نے سینے میں سانس توڑ دیا

ملی ہے دادِ سخن اب مجھے زمانے سے
بہ شکلِ شعر لہو دل کا جب نچوڑ دیا

کیا صبح ہے کیا شام یہ ہم سوچ رہے ہیں

اب آ کے تہِ دام یہ ہم سوچ رہے ہیں

یک قطرۂ خوں بھی نہیں اب آنکھ میں باقی

چھلکے تھے کبھی جام یہ ہم سوچ رہے ہیں

پھر نغمہ سرا ہو گئے مرغانِ گرفتار

کون آیا تہِ دام یہ ہم سوچ رہے ہیں

ڈرتے ہیں نہ کھا جائیں رہِ عشق میں لغزش

اے منزلِ دو گام یہ ہم سوچ رہے ہیں

اے منزلِ موہوم تری سمت بڑھے ہیں

کیا کچھ ہو بہر گام یہ ہم سوچ رہے ہیں

وہ جلوۂ بیباک تھا یا دیدۂ حیرت

تھا کوئی سرِ بام یہ ہم سوچ رہے ہیں

ہم سمجھتے تھے ہمارے ہوں گے آپ
یعنی فردا کے سہارے ہونگے آپ

ہم نے سوچا تھا خوشی مل جائے گی
کیا خبر تھی غم کے مارے ہوں گے آپ

دیکھ لی تاثیرِ جذبِ عشق کی
ہم نہ کہتے تھے ہمارے ہوں گے آپ

اپنی دُنیا میں اندھیرا ہی رہا
سوچتے تھے چاند تارے ہوں گے آپ

لوگ کہتے اور ہم سُنتے رہے
بے سہاروں کے سہارے ہوں گے آپ

یہ نہ سوچا تھا کہ اپنی ہی طرح
دل شکستہ غم کے مارے ہوں گے آپ

وہ ایک تصویرِ غم ہے تیری جو دل میں اپنے اُتار لی ہے

ہمیں گُماں یہ گزر رہا ہے حیات ہم نے سنوار لی ہے

ہماری ہمت کی داد دیں گے تو اہلِ دل ہی یہ داد دیں گے

کہ ہم نے حالِ تباہ میں بھی حیات ہنس کر گزار لی ہے

پُکارا اے دل کہ گلستاں میں عُروسِ صبحِ بہار آئے

روش، روش منتظر ہیں اب ہم نظر نظر اب سنوار لی ہے

یہ بے رُخی زندگی سے اپنی بجا نہیں تو پھر اور کیا ہے

کہ چند روزہ حیات ہم نے جو پائی ہے مُستعار لی ہے

روش، روش تم بکھیر دو کلیاں قدم قدم پر بچھا دو مخمل

خزاں زدہ گلستاں سے ہم نے فقط خیالی بہار لی ہے

نہیں ہے محتاج رہبروں کا ہمارا عزمِ حیات اے درد

اُلجھ کے راہوں کے پیچ و خم میں خود اپنی منزل سنوار لی ہے

کیسی تلاش صُبح ہے کیسی یہ رات ہے

کِس کشمکش میں جانے اسیرِ حیات ہے

ہم تو ہجومِ یاس میں بھی مُسکرا دیئے

شائد یہ بے رُخی بھی ترا التفات ہے

جو دل فریب بھی ہے مگر دل شکن بھی ہے

ہمدم یہ زندگی تو عجب واردات ہے

جو غم دیئے ہیں آپ نے وہ مستقل نہیں

لیکن انہیں سے رونقِ بزمِ حیات ہے

غم تیرا آج دل میں کوئی راز بن گیا
جو لب پہ آ گئی ہے وہ اپنی ہی بات ہے
ہر حادثہ حیات کا رُوداد بن گیا
ہم پر غمِ حیات کا یہ التفات ہے
اہلِ نظر سے پُوچھئے اُس دل کی وسعتیں
جس کے جلو میں درد کی اک کائنات ہے

•

۔۔ زندگی میں تھی جس سے کچھ ہلچل
وہ دلِ بے قرار تھا نہ رہا

اجنبی

اے دیوانے کچھ تو سوچ
اوروں کا دامن مت نوچ

کیسا نغمہ کیسی لوچ
شعر ہمارے سُن اور سوچ

ذہن ترا ہو جائے شل
سوچ سکے تو اتنا سوچ

اپنے بکھرے آنسو چُن
تارے مت امبر سے نوچ

دل حاکم ہے درد اپنا
عقل کرے بے شک سنکوچ

دل والوں کی بات نرالی — ان کی خوشی غم پر متوالی

آنکھ مِلا کر آنکھ جھکا لی — تم نے دل کی بات چھپالی

عکس تمہارا آنکھ میں لیکر — ہم نے اک تصویر بنا لی

تم بھی سوچو ہم بھی سوچیں — کِس نے کِس کی نیند چرا لی

ہم دیوانے یہ کیا جانیں — کون ہے داتا کون سوالی

عہدِ گذشتہ کی یادوں سے — ہم نے دِل کی بزم سجا لی

عشق بھلا کیا حُسن سے مانگے

ذہن بھی خالی دِل بھی خالی

جب ہمت بھی جاتے ہیں اک چوٹ سی کھاتے ہیں

رہبر ہو کہ رہزن ہو سب آنکھ چراتے ہیں

یہ کیسی پہیلی ہے، یہ کیسا معمہ ہے

دکھ درد کے ماروں کو ہمدرد رلاتے ہیں

یہ بھی تو عنایت ہے اے جذب وفا ان کی

وہ یاد نہیں کرتے پر یاد تو آتے ہیں

جب رات کے آنچل سے مہتاب نکلتا ہے

تب غم کے سمندر میں ہم ڈوب سے جاتے ہیں

اجنبی

ہنگامہ کہ سناٹا، اپنا تو یہ عالم ہے —

احساس کے بربط پہ ہر رنگ میں گاتے ہیں

اے گردشِ دوراں سُن پل بھر کیلئے تھم جا

ماضی کے جھروکوں سے وہ ہم کو بُلاتے ہیں

اُمید تو کوئی بھی پروان نہیں چڑھتی

ہم پھر بھی اُمیدوں کے گلزار کھلاتے ہیں

•

کسی غم زدہ پہ پڑی آنکھ جب

مُجھے یاد آیا کرم آپ کا!

اجنبی

ہر نفس ہے ہم پہ بھاری کیا کہیں

زندگی سے موت ہاری کب کہیں

آ پڑا ہے دل پہ کوئی بوجھ سا

یہ نوازش ہے تمہاری کیا کہیں

ان گنت تاروں کا جھرمٹ ہے گواہ

ہم نے شب کیسے گزاری کیا کہیں

آ گئی پھر دل کے زخموں پہ بہار

دوستوں کی غمگساری کیا کہیں

دِل شکن حالات پر ہم ہنس دیئے
یاد اب آئی تمہاری کیا کہیں

دے رہا ہے دِل پہ دستک غم ترا
پُر سکوں ہے بے قراری کیا کہیں

اجنبی راہوں میں ہم بھٹکا کئے
جُستجو کی تھی تمہاری کیا کہیں

اے شب وعدہ تو اب آنچل سمیٹ
تا بکے اَختر شماری کیا کہیں

کوئی ہمنوا ہو تو اپنا بتائے
کہاں تک کوئی دل پہ صدمے اٹھائے
ہمیں داستاں کوئی ایسی سنائے
دلِ مضطرب جس سے تسکین پائے
جنونِ وفا کی ہمیں آگہی ہے
خوشی راس آئے نہ غم راس آئے
کنارے سے ہی کٹ کر جو بہنے لگیں تو
کناروں پہ کیا کوئی کشتی لگائے
تری مسکراہٹ چرا لے نہ دنیا
گلوں نے تبسم چمن میں لٹائے
رہی گفتگو چاند تاروں سے شب بھر
سحر ہو چلی اب تو کچھ نیند آئے

نہ طوفاں سنبھالے نہ ساحل سنبھالے

سفینہ کریں ہم تو کس کے حوالے

اُسے ناخدا کوئی کیسے بنا لے

جو ساحل سے کشتی بھنور میں نہ ڈالے

تری جستجو نے وہ رستے نکالے

جو پہلے کبھی ہم نے دیکھے نہ بھالے

نہیں دُور فکر و نظر سے نشیمن

ہوا کیا کسی نے جو پر نوچ ڈالے

کبھی دوستی کا، کبھی زندگی کا

دلِ غمزدہ نے سبھی غم سنبھالے

تھی نہ تاثیر اپنی آہوں میں
کیوں مروت ہے اُن نگاہوں میں

ساتھ بھی دے تو کوئی کب تک دے
زندگی کی طویل راہوں میں

گرد بن کر اُڑی ہر اک منزل
کارواں گم کھڑے ہیں راہوں میں

دیکھ ہم سے نہ دل کی بات چھُپا
درد سا ہے تری نگاہوں میں

جس کو عنواں نہ مل سکا کوئی　　وہ کہانی ہے زندگی اپنی

پی گئے زندگی کی ہر تلخی　　تشنگی پھر بھی اپنی کم نہ ہوئی

وہ سمجھتے نہیں زباں اپنی　　ہم کو آتی نہیں زباں اُن کی

اے دلِ غمزدہ اُداس نہ ہو　　غم کے پہلو میں ناچتی ہے خوشی

اب کہاں ولولوں کی وہ دُنیا　　دل کی دُنیا تھی دل کے ساتھ گئی

کیا کریں دُشمنی زمانے سے　　مختصر سی ہے زندگی اپنی

دُشمنی بزدلی سے کرتے ہیں
ہم نے دیکھی ہے دوستی سب کی

آگہی کا جنہیں شعور نہیں
زندگی پر اُنہیں عبور نہیں

ہم ہی کچھ محو اپنے آپ میں ہیں
ورنہ تم سے تو اتنے دور نہیں

دوستی تھی ہی دشمنی کے لئے
دوستوں کا تو کچھ قصور نہیں

دوستو اور بھی عنایت ہو
دل ابھی غم سے چور چور نہیں

ہم جنوں کی حدوں کو چھو آئے
تم یہ کہہ لو کہ باشعور نہیں

زندگی کیوں نہ ہو عزیز ہمیں
موت اب درد ہم سے دور نہیں

ہمیں تم جو بھی چاہو وہ سزا دو
خطا کیا ہے مگر اتنا بتا دو

کہاں جائیں، کہاں پائیں تمہیں ہم
کہاں ہو تم ہمیں اپنا پتہ دو

تسلسل آنسوؤں کا کچھ تو ٹوٹے
ہمیں دو چار پل آ کر ہنسا دو

ہمیں تسلیم دُنیا کر رہی ہے
ہمیں حرفِ غلط کہہ کر مٹا دو

کہیں ایسا نہ ہو عنواں نہ سُوجھے
حدیثِ درد کا عُنواں بتا دو

سکوتِ یاس میں کیا کہہ گیا ہوں

سراپا درد ہو کر رہ گیا ہوں

اسے منزل پہ پہنچا بھی تو میں کیا

بچھڑ کر کارواں سے رہ گیا ہوں

نہیں اب حسرتِ گفتار مجھ کو

جو کہنا تھا مجھے وہ کہہ گیا ہوں

مری بربادیوں پہ ہنس دیئے وہ

میں ہنس کر چوٹ یہ بھی سہہ گیا ہوں

مرے قدموں کے نیچے کب زمیں تھی

میں ساحل کی طلب میں بہہ گیا ہوں

دلِ بے تاب سے گھبرا گیا ہوں
تمہاری انجمن میں آ گیا ہوں

تمہاری بے نیازی کا کرم ہے
میں اپنی داستاں دُہرا گیا ہوں

ارے میں نغمۂ دردِ نہاں تھا
قیامت ہے زباں پر آ گیا ہوں

تری تو خامشی بھی داستاں ہے
اگر سوچو تو کچھ سمجھا گیا ہوں

بزعمِ عقل جو کچھ کھو دیا تھا
جنوں کے فیض سے وہ پا گیا ہوں

اجنبی

تمہاری انجمن میں ہم نہ ہوں گے
مگر چرچے ہمارے کم نہ ہوں گے

جہاں ہوگا نہ کوئی دل کا محرم
وہاں اپنے لیے کیا غم نہ ہوں گے

سبھی ہوں گے تری محفل میں لیکن
ہمیں سا دیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

دلِ غم آشنا مایوس مت ہو
بہ فیضِ دوستاں دکھ کم نہ ہوں گے

کیا ہے مشتہر جن کی وفا کو
بھلا کیوں ہم سے وہ برہم نہ ہوں گے

ابھی تو خواب ہے دورِ مسرت !
مگر کیا پھر بھی اہلِ غم نہ ہوں گے ؟

اجنبی

ہر بات پہ کہتے ہو کہ سمجھے ہی نہیں ہو
اب تم ہی کہو کیسے تمہیں مرا یقیں ہو

جب حسنِ خود آرا ہی بصارت ہو نظر کی
پھر کیسے کہوں تم سے کہ تم کتنے حسیں ہو

ڈھونڈوں تو نہ پاؤں تمہیں تا حدِ نظر میں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ تم جیسے یہیں ہو

پردہ سا جو حائل ہے مری آنکھ کے آگے
ظاہر یہ ہوا اس سے کہ تم پردہ نشیں ہو

مانا کہ مسرت بھی بڑی چیز ہے لیکن
وہ غم بھی نہیں کم جو کسی دل کا امیں ہو

اجنبی

نگاہ سے دل چرانے والے تو نظر سے ملا تو پہلے
یہ آزمائش وفا کی کیسی، مجھے تو اپنا بنا تو پہلے

ابھی کہانی ہے نا مکمّل ابھی ہے بیکار فکرِ عنواں
ابھی لبا ہے خیال میں غم تو دل میں اسکو لبا تو پہلے

نہ پوچھ مجھ سے رہِ طلب میں جو تجھ پہ گزری سو مجھ پہ گزری
میں اپنی تجھ سے کہوں گا لیکن تو اپنی مجھ کو سنا تو پہلے

یہ کیسی منزل ہے آگہی کی کہ اک مکمّل سکوت سا ہے
کہ جیسے مجھ سے یہ کہہ رہی ہو تو آپ اپنے کو پا تو پہلے

یہ اب تو اے دردِ صرف ہم ہیں سلگ سلگ کے جو بجھ رہے ہیں
فغاں کہ جل جل کے بجھ چکا ہے ہمارا سوزِ وفا تو پہلے

پُھول سمجھ کر کانٹے چُننا جگ میں کام ہمارا ہے
تُو نے ہمیں دیوانہ کہہ کر پتھر سا دے مارا ہے

گھُوم رہا ہے محور پہ ہی میری قسمت کا تارا
یہ تارا جو ٹوٹ رہا ہے کِس کے بھاگ کا مارا ہے

دل بھی لگا یا داؤ پہ ہم نے عشق کی بازی سہل نہ تھی
اب کیا ہم سے پُوچھ رہے ہو کیا جیتا کیا ہارا ہے

عقل کے اندھے یہ جگ والے کیا جانے اُس شاعر کی
اپنا آپ مٹا کر جِس نے جگ کا رُوپ سنوارا ہے

وقت کے ساگر کی گہرائی کوشش پر بھی ہاتھ نہ آئی
اِس کی تھاہ کہاں پائی ہے اپنے آپ کو مارا ہے

اربابِ نظر کی محفل میں ہم سے بھی جنونی بستے ہیں
جو اہلِ خرد کے دعوؤں پر کچھ سوچ سمجھ کر ہنستے ہیں

منزل بھی وہی، راہی بھی وہی، کہنے کو کسی کا کوئی نہیں
یکسر ہے فقط بیگانہ پن اور اپنے اپنے رستے ہیں

ڈھونڈیں تو کہاں سے ڈھونڈیں ہم دکھ درد کا ساتھی کوئی نہیں
روتے ہیں تو تنہا روتے ہیں ہنستے ہیں تو سارے ہنستے ہیں

تم خوش ہو تو ہم بھی خوش ہیں مگر ہے فرق ہماری خوشیوں میں
تم ہنستے ہنستے روتے ہو، ہم روتے روتے ہنستے ہیں

ساقی بھی وہی، ساغر بھی وہی، وہ بات نہیں پیمانوں میں

دل جن کے سہارے زندہ تھا وہ جان کہاں ارمانوں میں

ہم پر بھی ذرا ہو چشمِ کرم ہم بھی ہیں ترے دیوانوں میں

ہم جنّت چھوڑ کے آ بیٹھے آزاد منش انسانوں میں

دل خوں جو ہو کر بہتا ہے بہنے دو اُسے تم بہنے دو

دِل کا تو ذرا بھی غم نہ کرو تم رنگ بھرو افسانوں میں

دیکھے یا سُنے ہیں تُم نے کہیں ایسے بھی شرابی کچھ تو کہو

جو اُبھرے ہوں میخانوں سے اور ڈوبے ہوں پیمانوں میں

جو پھول کھلیں گلزاروں میں وہ رونقِ محفل ہوتے ہیں

وہ جانِ بہاراں ہوتے ہیں جو پھول کھلیں ویرانوں میں

کیوں جان پہ تم بن آئے ہو، جینے دو ہمیں بھی فرزانو

وہ جان کہ پیاری ہے تم کو، ہے جان وہی دیوانوں میں

جو کچھ بھی کہا وہ ہم نے کہا، جو کچھ بھی کیا سو ہم نے کیا

جو آئے کسی کے جی میں کہے اب آ جو گئے بیگانوں میں

•

کوئی مے نوش جو ہوتا تو سمجھ ہی لیتا

خامشی دیر و حرم کی رودادِ غم ہستی ہے

ترا دردِ دل سے مٹانا پڑا

بہت دُور ماضی میں جانا پڑا

جو تھا یادِ ہم کو بُھلانا پڑا

ہمیں خود کو یُوں بھی چھپانا پڑا

ازل سے ابد کو ملانا پڑا

خیالی جہاں ہی بنانا پڑا

بھنور سے اُبھرنے کی خاطر ہمیں

ارے ہمدمو ڈُوب جانا پڑا

حقیقت کا جس پر ہوا کچھ گماں

اُسی کو فسانہ بنانا پڑا

جھوٹی ہے ہر حقیقت جھوٹے ہیں سب فسانے

یہ بھید کس نے سمجھا یہ راز کون جانے

تو داد دے سکے تو کچھ داد دے زمانے

آیا ہوں دیکھ تجھ سے میں پھر فریب کھانے

یہ گیت تو نے سمجھے صد شکر اے زمانے

تا دیر اب رہیں گے زندہ مرے ترانے

میں جی رہا ہوں تنہا تنہائیوں کے صدقے

کڑوی ہے یہ حقیقت، میٹھے ترے بہانے

کھو بھی سکیں نہ جس کو پا بھی سکیں نہ جس کو

یہ زندگی سنواری اُس حسنِ بے ریا نے

اے داستانِ ہستی تو دردِ مستقل تھی

بس آگہی کی دولت دے دی مجھے خدا نے

اے درد اب تو قصّہ کوئی نیا سُنا دے

اگلی محبّتوں کے قصّے ہوئے پُرانے

•

اپنی چشمِ کرم کے سائے میں

کوئی لمحہ گزار لینے دو

اپنی بربادی کا خود ہم نے تماشہ دیکھا
کیا تماشائی کوئی آپ نے ہم سا دیکھا

چشمِ امید سے کیا کیا نہ ستارے ٹوٹے
اے غمِ ذات تری بزم کا نقشہ دیکھا

بزمِ ہستی میں سبھی ہم سے تھے لیکن ہم نے
جُز غمِ دوست کوئی اور نہ خود سا دیکھا

ہر وفا کیش کا دُنیا نے بھرم توڑ دیا
ہم نے بادیدۂ پُرنم یہ تماشہ دیکھا

ایک تصویر سی ہے ذہن میں دھندلی دھندلی
ہم نے کچھ اس میں ترے پیار کا سپنا دیکھا

ہم جو سوتے تو ستاروں کو بھی نیند آجاتی
رات بھر ہم نے ستاروں کا تڑپنا دیکھا

ترا غم مقدر کی سوغات ہے
اُجالے کی خالق یہی رات ہے

مرے ہاتھ میں اب ترا ہات ہے
زمانے کی ہمدم یہی مات ہے

مری انجمن میں نہیں اور کچھ
مری انجمن تو تری ذات ہے

کبھی سوچتے تھے کہ کب دن ڈھلے
مگر اب تو دن بھی ہمیں رات ہے

یہ دُوری محبّت کا مقسُوم تھی
زمانے کا اس میں کہاں ہات ہے

ملا غم تو غم سے گلے مل لئے
ترے درد مندوں کی کیا بات ہے

میری خندہ لبی ہی نہیں دوستو میرے نغمے بھی دُنیا نے زخمی کیے

مَیں نے اس پر بھی شکوہ نہیں کچھ کیا میں نے اس پر بھی ہنس ہنس کے آنسو پیے

مُجھ کو منزل کا کوئی پتہ ہی نہیں میری منزل کو میری خبر ہی نہیں

مَیں نے پھر بھی فریبِ طلب کے لیے خود کو صد رنگ دھوکے پہ دھوکے دیے

میری ناکامیاں میری محرومیاں مجھ کو آخر تو اتنا بتا ہی گئیں

جس کا جادہ نہیں جس کی منزل نہیں زندگی وقف ہے اُس سفر کیلیے

میری تنہائیاں مجھ کو راس آگئیں میری ناکامیاں دل کے کام آگئیں

اے غمِ زندگی میں تصدق ترے تُو نے کیا سوچ کے مجھ کو حرمے دیے

مجھ کو سُود و زیاں کا کوئی غم نہیں لُٹ گیا ہُوں مگر کچھ گیا بھی نہیں

مَیں نے دُنیا کا دامن خوشی سے بھرا مجھ کو بدلے میں دُنیا نے غم دے دیے

میری بربادیاں کس سے منسُوب ہوں کیا کسی سے کہوں کس کا میں نام لُوں

دردِ خُود دستے میں خود بے مروّت رہا میں نے خود پر ہزاروں ستم خود کیے

ہر اک کی پلکیں بوجھل ہیں نیند آئی ہے سُننے والوں کو

اے دردِ حدیثِ رفتہ کے لب بند کرو، خاموش رہو

کچھ دُور تو میرے ساتھ چلو کچھ دیر تو میرے ساتھ رہو

اے قلبِ حزیں کے ارمانو کچھ اپنی کہو کچھ میری سُنو

کیا تجھ سے سکوتِ یاس کہوں اک آس بندھی ہے لیکن کیا

یہ گھائل پنچھی یادوں کے پر تول رہے ہیں اُڑنے کو

اک دِل ہے تنِ تنہا میرا اور اس کے ہزاروں دُشمن ہیں

ڈر ہے کہ نہ ہو جاؤں میں بھی بے دل سا کہیں اے ہم نفسو

اے عمر میں سب کچھ دیکھ چکا اس تیرگیٔ ودق صحرا میں

ہے کون جسے میں اپنا کہوں ہے کون یہاں جو میرا ہو

ماضی کے حسیں لمحوں کی ہنسی کچھ دُھندلی دُھندلی باقی ہے

اے دورِ گذشتہ کی یادو میں تم پہ ہنسوں تم مجھ پہ ہنسو

کسی بدگماں کا گماں ہو نہ جاؤں
کوئی ان سُنی داستاں ہو نہ جاؤں

ترے غم سے پہلو بچاؤں میں لیکن
اسیرِ غمِ دو جہاں ہو نہ جاؤں

تری بے نیازی کا ایمان بن کر
میں پابندِ کون و مکاں ہو نہ جاؤں

مرے غم پہ دُنیا کی نظریں لگی ہیں
میں رُودادِ ضبطِ فغاں ہو نہ جاؤں

اجنبی

خود اپنا نشیمن جلانے کی خاطر
مجھے ڈر ہے برقِ تپاں ہو نہ جاؤں

کہاں تک خیالوں کی بانہیں سمیٹوں
میں گردِ رہِ کہکشاں ہو نہ جاؤں

ترے راز دل میں سمو لوں مگر میں
سکوتِ غمِ جاوداں ہو نہ جاؤں

•

گری برق تو بن کے اُٹھے دھواں ہم
سرِ شاخِ گُل آشیاں چھوڑ آئے

تم مسلسل سکوت بن کے رہو
لوگ کہتے ہیں جو بھی کہنے دو
دردؔ اشکوں کی آبرو مت کھو
اپنے دامن میں منہ چھپا کر رو
بس چکے ہیں نفس نفس میں جو
لوگ کہتے ہیں ان کا نام نہ لو
آؤ دو چار پل تو ہنس گا لیں
پھر جو ہونا ہے وہ خوشی سے ہو
یہ چمن ہفت رنگ منظر ہے
تم اسے غور سے بھی دیکھو تو
جس میں ہلچل نہ کوئی ہنگامہ
کیا کہیں دردؔ ایسے جینے کو

مجھ سے رہتے ہیں کیوں سرگراں سے

کچھ تو کہہ دیں وہ اپنی زباں سے

ایسی دُوری نہ تھی دو دلوں میں

فاصلے آ گئے یہ کہاں سے

جو نہ گزری تھی وہم و گماں میں

اُن سے کہنی پڑی وہ زباں سے

سُن تو لی ہے مگر کیا بتاؤں

تم نے آواز دی کس جہاں سے

جس کا آغاز و انجام تُم ہو

وہ کہانی سُنو درمیاں سے

اجنبی

لاکھ پردوں میں تم تو نہاں تھے

ڈھونڈ لایا تمہیں میں کہاں سے

یہ تعلق نبھے گا کہاں تک

یہ تعلق تو ہے جسم وجاں سے

جس جگہ زندگی تھک کے بیٹھے

میرا عزمِ سفر ہے وہاں سے

وہ جبیں کس جگہ اب جھکے گی

اُٹھ گئی جو ترے آستاں سے

راز اپنا نہ تم رکھ سکے درد

اب شکایت ہی کیا رازداں سے

گلہ کروں، تو کروں کس کی کج ادائی کا
بھرم خودی کا رہے گا نہ کچھ خدائی کا

بہت قریب سے گزرا ہوں میں زمانے کے
مجھے شعور بھی ہے اپنی نارسائی کا

میں کیا کہوں کہ شب وعدہ کس طرح گزری
خوشی وصال کی دیکھی نہ غم جدائی کا

مرے خلوص کو تم سنگسار کرتے ہو
مجھے بھی کچھ تو اشارہ ہو لب کشائی کا

میں رند بھی ہوں خراباتی زمانہ بھی
مجھے غرور بھی ہے اپنی پارسائی کا

اجلبی

غم بھی صورت بدلنے لگا ہے
تیرے سانچے میں ڈھلنے لگا ہے
ظلمتِ شب سمٹنے لگی ہے
غم کا عنواں بدلنے لگا ہے
تیری رفتار لے کر زمانہ
تجھ سے آگے نکلنے لگا ہے
تیری یادوں کے آنچل تلے اب
دل کا ہر داغ جلنے لگا ہے

اب میں گلچیں سے شکوہ کروں کیا
گل کو گل خود مسلنے لگا ہے

اُن کا احساسِ غم اب تو یارو
میرے شعروں میں ڈھلنے لگا ہے

چارہ سازو ذرا تم سنبھلنا
درد کروٹ بدلنے لگا ہے

•

جن کو آنا تھا وہ نہیں آئے
ڈھل رہے ہیں حیات کے سائے

اجنبی

مرے حال سے بے خبر جانے والے

یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے

ترے بعد تجھ کو پکارے گی دُنیا

خوشی سے بھنور میں اُتر جانے والے

بھرم رہ گیا میرے سجدوں کا ورنہ

ترے نقشِ پا تھے سنور جانے والے

ترے نام کی زندگی بن گئے وہ

ترا نام لے لے کے مر جانے والے

گلوں کو مسلتے رہے چٹکیوں میں

گلوں کے تبسّم پہ مر جانے والے

زندگی خود سے ڈرنے لگی ہے   مجھ پہ تنقید کرنے لگی ہے

عقل دُنیا سے ڈرنے لگی ہے   بات حد سے گزرنے لگی ہے

رُوپ اُن کا نکھرنے لگا ہے   سوچ میری سنورنے لگی ہے

پھر مہکنے لگا ہے تخیّل   زُلف اُن کی بکھرنے لگی ہے

آؤ تجدیدِ پیماں کریں ہم   ہجر کی شب گزرنے لگی ہے

جب سے آنکھوں میں تم آ بسے ہو   دل سے دُنیا اُترنے لگی ہے

درد آواز دی کس نے ہم کو
نبضِ ہستی ٹھہرنے لگی ہے

تنہائی جسے راس آئی ہے
وہ قسمت میں نے پائی ہے

وہ بات سمجھ کب آنی تھی
حالات نے جو سمجھائی ہے

ارباب نظر کی محفل میں
اک میں ہوں مری تنہائی ہے

جس بات پہ دنیا ہنستی ہے
آنکھ اُس پہ مری بھر آئی ہے

اے دردِ زمانہ کیا جانے
دانستہ ٹھوکر کھائی ہے

ایک خموشی لاکھ سکوں

ورنہ میں خاموش رہوں

نام کسی کا کیوں کہہ لوں

میں خود اپنا دشمن ہوں

تیری سدھ بدھ کیسے لوں

اپنے آپ سے غافل ہوں

کس کس کا عنوان بنوں

کس کس کو افسانے دوں

شعلہ بن یا راکھ کا ڈھیر

بات نہ کچھ سوز دروں

جز تیرے میں کچھ بھی نہیں

ساتھ ترے میں سب کچھ ہوں

بنتے ہیں بہت خود کو معصوم سمجھتے ہیں
ہم اُن کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہیں

ہم سادہ دلوں کا تو مسلک ہے جُدا سب سے
ظالم کو بھی ہم یارو مظلوم سمجھتے ہیں

دُنیا کی خوشی کیا ہے کس بات سے خوش ہو گی
یہ بات فقط ہم سے مغموم سمجھتے ہیں

مُردوں کی نمائش میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں
جو ہم کو بھی دانستہ مرحوم سمجھتے ہیں

شوریدہ سری اُن کی دیکھو تو سرِ مقتل
اے درد جو قاتل کو معصوم سمجھتے ہیں

میری ہنستی آنکھوں میں رُوداد سی کچھ رُوداد ہے ساتھی

صبر سے غم کے آنسو پینا صبر نہیں بے داد ہے ساتھی

ڈرنے سے الزام نہ آئے اہلِ محبت کی ہستی پر

اتنا سوچ کے چُپ رہتا ہوں دل میں تو فریاد ہے ساتھی

اپنی محرومی کا شکوہ اب جو کریں تو کس سے کریں ہم

ہر کوئی غمگین ہے ساتھی، ہر کوئی ناشاد ہے ساتھی

میرے دلِ بیتاب نے جس کو لاکھوں ہی عنوان دیئے تھے

وہ تیرا ہی افسانہ تھا کچھ تجھ کو بھی یاد ہے ساتھی

طائر کی پرواز کا مقصد فکر ہے آب و دانے کی

وہ کیا جانے جال بچھائے تاک میں کیوں صیاد ہے ساتھی

ڈوب نہ جائے لے ہستی کی ٹوٹ نہ جائے سازِ اُلفت

سوچ رہا ہوں کیونکہ چھیڑوں نغمہ نہیں فریاد ہے ساتھی

نہ جانے کب سے اسیرِ غمِ حیات ہُوں میں

الم رسیدہ سہی طالبِ نجات ہُوں میں

مری حیات سے زندہ ہے کائنات تری

تری حیات ہوں میں رُوحِ کائنات ہُوں میں

جسے زمانہ بہ صد فخر کر سکے نہ بیاں

جو مٹ سکے نہ دلوں سے وہ وارداتِ ہُوں میں

کچھ اور ہوں گے تقاضائے نازِ حُسن مگر

خود آج مائلِ ترکِ تعلقات ہُوں میں

تمہارے نازِ محبت گراں گزرتے تھے

نہ ہاں کہ طالبِ یک چشمِ التفات ہُوں میں

یہ زخمِ ترکِ محبت بھی درد سہہ لُوں گا

خُدا گواہ کہ مانوسِ حادثات ہُوں میں

کب تک تمہاری یاد سے جی کو جلائیں ہم

ایسا نہ ہو کہیں کہ تمہیں بھول جائیں ہم

محرم نہیں ہے تو، نہ سہی، یہ مگر بتا

کس کو حدیثِ دردِ تمنا سنائیں ہم

اک واسطہ ہے گردِ تعلق سے دل کو آہ

دامن تمہاری یاد سے کیونکر بچائیں ہم

مایوس ہو چلے ہیں تمہاری تلاش میں

اب سوچتے ہیں کیوں نہ تمہیں بھول جائیں ہم

اے اضطرابِ دردِ تبا آمدہ کتنی دیر

ناکامیِ حیات پہ یوں مسکرائیں ہم

اے امیرِ کاروانِ زندگی

گرد کی مانند منزل اُڑ چلی

بڑھ گئی وحشت جنوں کی اور بھی

بات جب چھیڑی کِسی نے ہوش کی

پیشتر اس سے بھی دُنیا تھی یہی

لیکن ایسی حشر ساماں تو نہ تھی

اے مزاجِ دوست تو برہم نہ ہو

تیری خاطر تیری محفل چھوڑ دی

ہم کو بننا تھا فسانہ بن گئے
زیست کو ہونا تھا عنواں ہو گئی

اک نگاہِ لطف ہی دیکھی نہیں
ورنہ ہر جذبے کی صُورت دیکھ لی

ہم تو عنواں کے تجسّس میں رہے
دور ہم سے داستاں گم ہو گئی

•

یارانِ بے وفا مجھے اتنا بتا گئے
جس میں وفا کا رنگ ہو وہ دوستی نہیں

اجنبی

دامن میں کہیں خار کہیں پھول رہے ہیں

ہم گلشنِ ہستی کو کہاں بھول رہے ہیں

چمکیں گے ہم اک روز مہ و مہر کی مانند

ہم بھی ترے قدموں کی کبھی دھول رہے ہیں

اک عمر کا حاصل ہے فقط جن کا تصوّر

کس دل سے کہیں ہم کہ انہیں بھول رہے ہیں

اپنوں نے جو اپنایا نہیں ہم کو تو کیا غم

غیروں کی نگاہوں میں تو مقبول رہے ہیں

ہے گوش بر آواز وہاں بزم طرب تو
ہم دل کے فسانے کو یہاں بھول رہے ہیں
کل ہوں گے وہی زیست کے افسانے کا عنواں
جو آج سرِ دار و رسن جھول رہے ہیں
سوچا تھا کہ ملتے ہوئے تم سے جو کہیں گے
اے دردِ دل وہی بات تو ہم بھول رہے ہیں

•

خرد کی حکمرانی ہے دلوں پر
محبت ٹھوکریں کھاتی رہے گی

اجنبی

کِس کِس کو اب یاد کریں ہم کِس کِس کو اب روئیں

مدہوشی کی چادر ہو تو لمبی تان کے سوئیں

کوئی نہیں ہے جس کے آگے درد جیا کا روئیں

اتنا جان لیا جب ہم نے اپنا پن کیوں کھوئیں

اِس دُنیا میں خوش رہنے کا حل تو ڈھونڈ لیا ہے

لیکن اس میں کب تک یار دو اپنے آپ کو کھوئیں

رات برہ کی کاٹ لی ہم نے تارے گِنتے گِنتے

اب دل کی بے تاب امنگو تم جاگو ہم سوئیں

بیل جُتے ہل کے ہتھے پر ہاتھ رکھا تو جانا

محنت اپنی پھل نہیں اپنا کیا کاٹیں کیا بوئیں

سمٹ آئے ہم ایک عنواں میں آخر

جہاں در جہاں داستاں ہوتے ہوتے

اجنبی

کہہ رہے ہیں درد تفسیر حیات
سُن رہی ہے اندھی بہری کائنات

وہ گھڑی

اب گوالا گوکل کا — وہ گھڑی کب آئے گی
راس کب رچائے گا — کوئی کچھ بتائے بھی

بانسری کی تانوں سے — آرزو کے خاکوں میں
کنج کو جگائے گا — رنگ بھر کے لائے گی

گیت بن کے لہروں کا — برندابن کی البیلی
جمنا تٹ پہ چھائے گا — آرتی سجائے گی

اب کدم کی چھاؤں میں — اپنے روٹھے موہن کو
کب وہ وقت آئیگا یہ — اس طرح منائے گی

نند کا دُلارا جب — پیار سے نہ مانا تو
بانسری بجائے گا — خود بھی روٹھ جائیگی

شام کی یہ رادھا ہے
شام کو نبھائے گی
دودھ سے نہائے گی
چاند کو لجائے گی
وہ گھڑی کب آئے گی
کوئی کچھ بتائے بھی
وقت کے تھپیڑوں میں
کھا رہی ہے ہچکولے
ناؤ ہے یہ کاغذ کی
کیوں نہ میرا من ڈولے
کوئی بھی نہ کچھ سوچے
کوئی بھی نہ کچھ بولے

زندگی کی راہوں میں
موت یوں ہے منہ کھولے
منتظر حوادث ہیں
آندھیوں نے پر تولے

یہ عجیب بستی ہے
ہر طرف ہے ویرانہ
چہرہ جانا پہچانا
لگ رہا ہے بیگانہ

کس طرح یہ بے مہری
اب دلوں سے جائے گی

اب ہماری متھرا میں
کب بہار آئے گی

اب کوئی کنہیا کب
بانسری بجائے گا

وہ گھڑی کب آئے گی
کوئی کچھ بتائے بھی

•

کھوٹا سکّہ

میں نے خوب سمجھا ہے
ہر کسی سے سنتا ہوں

میں نے خوب پرکھا ہے
ہر کوئی سنتا ہے

گیت بک نہیں سکتا
کھوٹا سکّہ بھی اکثر

پھر بھی گیت لکھا ہے
کام آ ہی جاتا ہے

پھر بھی گیت لکھوں گا
دل میں اک الاؤ سا

اپنے فن کو پرکھوں گا
رات دن دہکتا ہے

اور اس الاؤ میں — یہ کہاں سمجھتی ہے
دل کا خُون جلتا ہے — ایسی نادہ مستی ہے
رُوح ڈانے دانے کو

پُھول سے مرے بچّے — اب یہاں ترستی ہے
رات دن بلکتے ہیں — جس طرف نظر ڈالوں
مُنہ سے کچھ نہیں کہتے — یاسیت برستی ہے
بُھوک سے سسکتے ہیں

مُنہ سے کچھ نہیں کہتے
پُھول سے مرے بچّے
مامتا بھری چھاتی — ماں کی خشک چھاتی ہے
خُون دے تو سکتی ہے — یُوں چمٹ کے سوتے ہیں
دُودھ دے نہیں سکتی — دُودھ تو نہیں پاتے
بُھوک ننّھے بچّوں کی — خُون پی کے سوتے ہیں

اجنبی

اور میں حزیں شاعر
قہقہوں میں روتا ہوں
شاعری کے آنچل میں
اپنے غم سموتا ہوں
انگلیاں خیالوں کی
خون میں ڈبوتا ہوں

گیت بک نہیں سکتے
اور میں حزیں شاعر
گو کہ سب سمجھتا ہوں
پھر بھی گیت لکھتا ہوں

کھوٹا سکہ چلتا ہے
گیت بک نہیں سکتا
بھوک مر نہیں سکتی
پیٹ بھر نہیں سکتا
ہر کوئی یہ کہتا ہے

کاش کہ مرے بچے
گیت سن کے سو جائیں
خواب کے جزیروں میں
مسکرا کے کھو جائیں

اجنبی

سازہی تو خالی ہے
گیت تو نہیں خالی

پھُول سے مرے بچّے
گیت سُن کے سوجائیں

پیٹ ہی تو بھُوکا ہے
روح تو نہیں بھُوکی

خواب کے جزیروں میں
مُسکرا کے کھو جائیں

کاش وقت ٹل جائے
کھوٹا سکّہ چل جائے

•

تنہائی

مجھ کو بھی تو جینا ہے
اب کسی بہانے سے
خواب میری آنکھوں کے
ہو گئے فسانے سے
ہر کوئی یہ کہتا ہے
کیا کہیں دوانے سے
اور میں سمجھتا ہوں
کیا کہوں زمانے سے

آگ سی سلگتی ہے
اب تو میرے سینے میں
اب تو لطف آتا ہے
دل کا خون پینے میں
کیا مزا ہے جینے میں
زندگی تکلف سے
آگئی قرینے میں

اجنبی

زندگی امانت ہے
اس لیے میں جیتا ہوں
دامن آرزوؤں کا
چاک کر کے سیتا ہوں

ہر کسی کی سنتا ہوں
ہر کسی کی سہتا ہوں
دیکھ کس خموشی سے
اپنی بات کہتا ہوں
اجنبی سا بن کے مَیں
اپنے گھر میں رہتا ہوں

میری اجنبیت یا
مجھ کو مار ڈالے گی
اور یا مری وحشت
بال و پر نکالے گی
بات کی طرح دنیا
پھر مجھے اچھالے گی

ہر طرف ہے سنّاٹا
خامشی لرزتی ہے
مَیں وہ بات کہتا ہوں
دل پہ جو گزرتی ہے
دل کا خون پی پی کر
ہر امنگ مرتی ہے

اجنبی

میری آگہی مجھ سے
کیا سلوک کرتی ہے
اب تو میری تنہائی
خود مجھی سے ڈرتی ہے

کتنی جان لیوا ہے
آہ میری تنہائی
خود ہی میں تماشہ ہوں
خود ہی میں تماشائی
نبض میرے ہاتھوں میں
وقت کی کہاں آئی

میں نے کب سکوں دیکھا
میں نے کب خوشی پائی

سونی سونی راہیں ہیں
اجڑے اجڑے میلے ہیں
چل چلاؤ دنیا کا
وقت کے جھمیلے ہیں
روپ بھر کے اپنوں کا
لوگ مجھ سے کھیلے ہیں
اتنی چوٹیں کھائی ہیں
اتنے صدمے جھیلے ہیں
کل تو میں اکیلا تھا
آج سب اکیلے ہیں

ہاں یہی ہیں وہ راہیں
ہاں یہی ہیں وہ رستے
کارواں خیالوں کے
کل جہاں سے گزرے تھے
یہ ہیں جانے پہچانے
ان کسیلی راہوں پر
مرے نقشِ پا نے بھی
وہ نشان چھوڑے تھے
جن سے میں یہ سمجھا تھا
اب نہیں یہ مٹنے کے

بس یہی تو سوچا تھا
بس یہی تو سمجھا تھا
ٹوٹ ہی گیا آخر
خواب سا جو دیکھا تھا

اب تو کچھ خراشیں ہیں
دل شکستہ یادیں ہیں
اک کسک سی باقی ہے
جام ہے نہ ساقی ہے

اجنبی

پھانس اک کلیجے میں
اس طرح سے چبھتی ہے
آنکھیں مسکراتی ہیں
دل سے ہوک اُٹھتی ہے

کل بھی میں اکیلا تھا
آج بھی میں تنہا ہُوں
اور کل جو آئے گی
اُس کو بھی سمجھتا ہُوں

سُونی سونی راہیں ہیں
غمزدہ نگاہیں ہیں

•

خاموشی

تیرگی کے گھیرے ہیں
اب یہاں سویرے ہیں
روشنی کے پردے ہیں
دُور تک اندھیرے ہیں
دِل کا غم مٹانے کو
میرے راز پانے کو
اہلِ دہر میرے ہیں

آنسوؤں پہ شبنم کے
پھُول مُسکراتے ہیں
ٹوٹنے سے بربط کے
گیت چوٹ کھاتے ہیں
دل کا بھید لیتے ہیں
دوست بھُول جاتے ہیں
دوستی کے دھوکے ہیں
پھر بھی لوگ آتے ہیں

اجنبی

زندگی کی راہوں کے
ہیں عجیب افسانے
روپ بھر کے اپنوں کا
مل رہے تھے بیگانے
اپنی اپنی دُھن کے سب
تھے وہ لوگ دیوانے

رات نے جلا پائی
مُجھ کو آگہی میری
کس جہاں میں لے آئی
ہر طرف خموشی کی
بج رہی ہے شہنائی

میں کسی کی کیا سمجھوں
کوئی میری کیا جانے

خامشی کے بربط پر
اب میں گیت گاؤں گا
لاکھ رنج و غم ہونگے
پھر بھی مسکراؤں گا

دُھند سی مُسلط ہے
یا نظر ہے دُھندلائی
صُبح کے تصور سے

دل کی بے کلی کو اب
خود سے بھی چھپاؤں گا

آگہی کی محفل پر
اس طرح سے چھاؤں گا

شیشے کا مسیحا کیا
شیشے جوڑ سکتا ہے
جس نے دل نہ توڑا ہو

کیا وہ توڑ سکتا ہے
جس نے خود کو چھوڑا ہو
مُجھ کو چھوڑ سکتا ہے

خامشی کے بربط کو
کون توڑ سکتا ہے

ماورا

آسماں کی رفعت سے
میں زمیں پہ آیا ہوں
خود سے جو گریزاں ہو
میں وہ ایک سایہ ہوں
لیکن اپنے دامن میں
گیت بھر کے لایا ہوں

زندگی کے صحرا میں
مَیں بھی اک بگولا ہوں
آسماں کی وسعت میں
بجلیوں کا جُھولا ہوں
کون جانے کیا کھویا
اور کیا میں بُھولا ہوں

اجنبی

بے سبب ہنسی اپنی
مُنتشر خیالوں کے

مَیں نے خود اُڑائی ہے
جال بُن رہا ہوں مَیں

ہر کسی سے دانستہ
پھُول چُن لئے تُم نے

ہنس کے مات کھائی ہے
خار چُن رہا ہوں میں

بات خود مجھے اپنی
آپ اپنے ہونٹوں کی

کب سمجھ میں آئی ہے
بات سُن رہا ہوں مَیں

مفکر

آج کچھ بھی ممکن ہے
لاکھ سر پٹکتا ہوں

میری ایک رائے پہ
خود سے خود الجھتا ہوں

ہر کسی کی نظریں ہیں
سوچ کے شراروں سے

آج میرے سائے پہ
ذہن کو جھلستا ہوں

اک نظر نہیں لیکن
بجھتا ہوں نہ جلتا ہوں

دل کی ہائے ہائے پہ
رات دن سلگتا ہوں

اجنبی

چاہتا ہے جی کتنا — یہ مری جنوں مندی
دل کی تھاہ پانے کو — میرے کام آئے گی
یاس کام آتی ہے — دیکھ کر مجھے دنیا
اس میں ڈوب جانے کو — مجھ سے سہم جائے گی
سوچتا ہوں بہے جاؤں — اور جنوں کی راہوں میں
کچھ نہ کچھ زمانے کو — مجھ کو چھوڑ جائے گی

گیت بن رہا ہوں میں — ہر کسی سے کہتا ہوں
گیت سن رہا ہوں میں — وقت کی بلندی سے
فکر کے ہیولوں سے — آسکو تو آ جاؤ
جال بن رہا ہوں میں — دوستو مرے پیچھے
آپ اپنے گلشن سے — وقت تم سے آگے ہے
پھول چن رہا ہوں میں — میں ہوں وقت سے آگے

اجنبی

اندھی بہری دنیا کو فکر اور تجسّس کے
کیا مجھے سُنانا ہے یہ سوال رکھے ہیں
خُود کو پا کے کھویا ہے ایک ایک لمحے ہیں
خود کو کھو کے پایا ہے ماہ و سال رکھے ہیں
سُن سکے تو سُن دُنیا ذہن سے بٹارے ہیں
یہ مرا فسانہ ہے ناگ پال رکھے ہیں

جو بھی کچھ گُزرنی ہے
کب تک اُس کو ٹالوں گا
اپنے آخری پل کو
جاوداں بنا لُوں گا
موت سے گلے مِل کر
زِندگی کو پاؤں گا

تھکن

مجھ پہ تیری یادوں کے
کھل رہے ہیں دروازے
ہو رہے ہیں پھر بیدار
خواب بیتی راتوں کے
میری تیری باتوں کے
بن رہے ہیں افسانے

کتنے صحرا چھائے ہیں
منتشر خیالوں کے
دور تک پریشاں ہیں
سلسلے سوالوں کے
کس لئے ہوئے دشمن
لوگ باکمالوں کے

جانے تو نے کیا کھویا   تو نے مجھ کو پہچانا
جانے میں نے کیا پایا   میں ہوں تجھ سے بیگانہ
ہے مرے تعاقب میں   تو کہ جس کا عنواں ہے
آج تک مرا سایہ   میں وہی ہوں افسانہ
میں تجھے بتاؤں کیا   عقل جس پہ حیراں ہے
میرے ہاتھ کیا آیا   میں رہا وہ دیوانہ

جُز ترے کسی سے کیا   میں نے ہر طرح سوچا
اپنی بات میں کہتا   میں نے ہر طرح جانا
اُٹھ گئے تری محفل سے   دیکھ لے مجھے تُو بھی
میں بھلا کہاں رہتا   میں رہا تری دُنیا
غم خوشی کا حاصل ہے   میں رہا تری تعبیر
کس لئے نہ غم سہتا   میں رہا ترا سپنا

اجنبی

حادثہ نہیں کچھ کم — تو نے مجھ کو ٹھکرایا

دل کا خون ہو جانا — مَیں نے تجھ کو اپنایا

ہر لبِ شکستہ پر — تو خرد کی بہکائی

سہل تو نہیں گانا — مَیں جنوں کا بھرمایا

مَیں تجھے بتاؤں کیا — تُو جفا کی گرویدہ

تُو نے کب مجھے جانا — مَیں وفا کا سرمایہ

اب مجھے یہ خدشہ ہے

داستاں نہ ہو جاؤں

جستجو میں خود اپنی

مَیں کہیں نہ کھو جاؤں

کاش نیند آ جائے

کاش اب مَیں سو جاؤں

تناسبِ وقت

لوگ اپنی ہستی پر
جھوم جھوم جاتے ہیں
اور ہم تماشائی
تالیاں بجاتے ہیں

ہم بھی اپنی نظروں کو
کاش کے ڈبو سکتے
اور اپنے ماضی کی
یاد دل سے دھو سکتے

زندگی کے ساحل پر
ہم نے اک جہاں دیکھا
اور سب کو دعویٰ تھا
زیست کا نشاں دیکھا

آنے والی کل کیا ہو
کل کسی نے دیکھی ہے
آج پر بھروسہ ہے
آج زیست اپنی ہے

اجنبی

ہم نے تیر پھینکے ہیں
اس طرح خیالوں کے
سینے ہو گئے چھلنی
سنگ دل سوالوں کے

پھر نصیب کب ہونگے
یہ رُکے رُکے لمحے
ہم کو ہے طلب جن کی
جانے کتنی صدیوں سے

آج درد کی رُوداد
سو رہی ہے ہونٹوں پر
دیکھ لیں اسے ہم بھی
آج اک نظر بھر کر

سوچنے کی فرصت ہے
سوچتے ہیں کیا سوچیں
کیوں نہ اپنی سوچوں کے
آج بال و پر نوچیں

تنگی

کشمکش میں جینے کی
زندگی گذاری ہے
دن بھی ہیں گراں مجھ پہ
اور شب بھی بھاری ہے

درد کو جگاتا ہوں
نیند کو سُلاتا ہوں
دِل شکستہ نغموں کے
بول گنگناتا ہوں

ناچتے ہیں نظروں میں
اب تو کتنے ویرانے
کیا ہو زیست کا انجام
یہ تو اب خُدا جانے

آرزو کے خاکوں میں
رنگ ہے نہ رعنائی
ہو چکی مری قسمت
اِک طویل تنہائی

اجنبی

اب تو ہم نفس مجھ پر
انگلیاں اُٹھاتے ہیں
اُن سے کیا شکایت ہو
وقت کے تقاضے ہیں

منزلوں سے کٹ کر ہیں
راستے میں بھٹکا ہوں
آپ اپنی آنکھوں میں
خار بن کے کھٹکا ہوں

سانس سانس سینے میں
اک چھُری سی چلتی ہے

یُونہی صبح کرتا ہوں
یُونہی رات ڈھلتی ہے
بات بات پر ہنسنا
اب تو میری عادت ہے

ذات سے مجھے اپنی
خود ہی شکایت ہے

وقت کی گلی سے درد
رینگتی ہُوئی گھڑیاں
جانے کس جگہ پہنچیں
سونی ہوگئیں گلیاں

اجنبی

ان گنت تقاضے ہیں
زندگی کے ہونٹوں پر
کر سکوں گا میں پورے
اس طرح بھلا جی کر

سوچتا ہوں کس در پر
بے جھجھک میں دستک دوں
شہر تو یہ میرا ہے
پھر بھی اجنبی سا ہوں

سوچنے کو سوچی ہیں
میں نے لاکھ تدبیریں

مٹ سکیں نہ قسمت کی
پھر بھی مجھ سے تحریریں

لو یہ مان لیتا ہوں
میں نہیں بھلا انساں
یہ تو کون مشکل ہے
یہ تو ہے بہت آساں

اے شریف انسانو
تم کہا مرا مانو
چھوڑ کر مجھے اب تو
اپنا آپ پہچانو

شکستہ آرزو

موت کے تجسس میں
زندگی بھٹکتی ہے
سانس سانس سینے میں
رات دن کھٹکتی ہے
لاکھ پھول گرتے ہیں
اک کلی چٹکتی ہے

ذہن میں خیالوں کے
سرد لاشے دفنا کر
آ گیا ہوں مرگھٹ پر
زندگی سے گھبرا کر
اس جگہ سے لے جائے
کون مجھ کو سمجھا کر

اجنبی

میں ہوں ایک دیوانہ بھولی بسری یادوں کا
کون مجھ کو سمجھائے مرثیہ سناتا ہوں
خود کو جو نہ پہچانے تربتِ تمنّا پر
کون اُس کے پاس آئے اک دیا جلاتا ہوں
اجنبی تصوّر کو دل کی اُجڑی بستی کو
کوئی کیسے اپنائے پھر سے اب بساتا ہوں

داستاں کہے کس سے میں نے پھول کاغذ کے
راستے کی ویرانی ان گنت بنائے ہیں
کس طرح چلی جائے اور جانے کتنے ہی
دیدہ ور کی حیرانی گلستاں کھلائے ہیں
روشنی کی صورت کب فاصلے مسافت کے
ظلمتوں نے پہچانی ساتھ ساتھ آئے ہیں

اجنبی

راہ چلتے لوگوں سے
راہ پوچھوں کیسے
اجنبی نہ ہو کر بھی
اجنبی رہوں کیسے

دل شکستہ بستی ہے
بات یہ کہوں کیسے

اب تو بام و در سے بھی
تیرگی برستی ہے
اور میری دنیا تو
نور کو ترستی ہے
روشنی کی ناگن ہی
روشنی کو ڈستی ہے

ذات سے مجھے اپنی
اب تو خوف آتا ہے
اک مہیب سناٹا
روح کو ڈراتا ہے

دل کا درد سینے میں
آگ سی لگاتا ہے

رنج و غم کے روزن سے
جھانکتا رہوں کب تک
ساتھ اپنے سائے کے
بھاگتا رہوں کب تک
آرزوئیں خوابوں کی
جاگتا رہوں کب تک

ہمراہی

گاہ پیچھے ہٹتا ہے
چلتے چلتے رُکتا ہوں

گاہ آگے چلتا ہے
بے سبب جھجکتا ہوں

کیا کہوں یہ سایہ بھی
اَور اپنے سائے کو

پینترے بدلتا ہے
دیکھ کر بِدکتا ہوں

ساتھ اپنا سایہ ہے
یا کوئی پرایا ہے
جانے کتنی دُوری سے
میرے ساتھ آیا ہے

کیا حسیں امتزاجِ ہستی ہے

حُسن ملہار عشق دیپک راگ

صدائے دل پہ ہُوا ہے یہ بارہا دھوکا

کہ جیسے تُم نے مجھے دُور سے پُکارا ہے

آج اُس روتی آنکھ کو وہ بھی روتے ہیں
کل تک رونے والوں پر جو ہنستے تھے

•

کہہ رہے ہیں دردِ تفسیرِ حیات
سُن رہی ہے اندھی بہری کائنات

•

مَیں نہیں جانتا جنہیں اے دردؔ
ان کی ہر بات محرمانہ ہے

•

تم ہماری فکر چھوڑو دوستو
ہم نے کی ہے زندگی سے دل لگی

•

یہ جان کر کہ موت ہے منزل حیات کی
ناکامیٔ حیات کا ماتم نہیں کیا

•

جہاں بحث عنواں پہ ہوتی رہے گی
وہاں درد کی ہم داستاں چھوڑ آئے

•

جہاں تک سُن سکو آواز میری تُم چلے آؤ
جہاں خاموش ہو جاؤں وہیں تم ڈھونڈنا مجھ کو

•

خوشا اے دوست یہ دردِ محبت
ہمیں احساسِ تنہائی نہیں ہے

•

کہے گا وہ کیا داستاں زندگی کی
بساطِ طلب پر جو جیتے نہ ہارے

•

ایک عالم ہے اپنی آنکھوں میں
کون جانے یہ کِس کا افسوں ہے

•

سکوتِ یاس کبھی تو جواب دینے دے
کسی نے آج بھی شائد ہمیں پکارا ہے

•

قدم قدم پہ مجھے دوست بیشمار ملے
میں کیا کہوں کہ کوئی بھی مزاج داں نہ ملا

•